November
2020

جدید ترادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

محنتانہ

محنت وصول کرنے کے خوابوں میں کھو گیا
جس پر چلا رہا تھا کلہاڑے میں صبح سے
تھک کر اُسی درخت کے سائے میں سو گیا

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL	Freight Forwarding	Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

Karachi: (021) 34541301-7 **Lahore:** (042) 36363300-7
Sialkot: (052) 3554301-6 **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-5
Faisalabad: (041) 8542924 **Peshawar:** (091) 5806565 **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 28 - نومبر 2020 - شمارہ نمبر: 11

ایڈیٹر: عمران منظور

مجلس ادارت

نجیب احمد	اعجاز رضوی	نعمان منظور	کنور امتیاز احمد	جاوید احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران - حاذق اسد

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق:

قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں

فیصل بینک لمیٹڈ

ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور

اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور- 53700

فون: 3-92-42-37513000 فیکس: 92-42-37512517

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

عمران منظور ایڈیٹر و پبلشر اور پرنٹر نے ٹریک این ٹائی پرنٹرز 16 کلومیٹر زرعی فارم نزد اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا وَأَنْتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	حسن عسکری کاظمی، سید ریاض حسین زیدی، مرزا عاصی اختر، عقیل رحمانی	7 تا 10
2	نعت	آصف ثاقب، محمد یٰسین قمر، سید ریاض حسین زیدی، نسیم سحر، محمد انیس انصاری، عقیل رحمانی، خورشید بیگ میلسوی، اکرم ناصر، خاور اعجاز، سرور حسین نقشبندی، ندیم عباس اشرف، شہزاد احمد شیخ، محمود کیفی	11 تا 23
3	عقیدت	سرور حسین نقشبندی	24
4	رباعیات	محمد ارشاد	25
5	قطعات	طاہر ناصر علی	26
6	ہائیکو	خاور اعجاز	27
7	دوہے	نیاز جیراجپوری	28
8	ملی نغمہ	منظور ثاقب	29
9	افسانے	پیروز بخت قاضی، سیما پیروز، نیلم احمد بشیر، کلیم خارجی، انعام الحسن کاشمیری، عامر نیر، کنزیٰ خالق	30 تا 79
10	غزلیں	خالد احمد، آصف ثاقب، روحی کنجاہی، سید ریاض حسین زیدی، جلیل عالی، اعجاز کنور راجہ، حسن عسکری کاظمی	80 تا 145

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
10	غزلیں	جمیل یوسف، شفیق سلیمی، نسیم سحر، محمد ارشاد، راحت سرحدی حسن عباس رضا، رشید آفریں، صفدر صدیق رضی گلزار بخاری، عقیل رحمانی، منظور ثاقب، اکرم ناصر، سید ضیا حسین ممتاز راشد لاہوری، ایم ارشد ارشد، علی اصغر عباس، سعد اللہ شاہ، خاور اعجاز، کبیر اطہر، شوکت محمود شوکت، احمد جلیل، طاہر ناصر علی رخشندہ نوید، اصغر علی بلوچ، شفیق احمد خان، حسنین سحر اشفاق ناصر، ہمایوں پرویز شاہد، رانا سعید دوشی، صغیر احمد صغیر یعقوب پرواز، زبیر فاروق، جاوید شیدا، اشرف نقوی ریاض رومانی، آفتاب خان، انصر حسن، عطا العزیز ذکی طارق، امر مہکی، وسیم عباس، افروز رضوی، فرح شاہد شہزاد احمد شیخ، تاثیر نقوی، ارشد محمود ارشد، آصف شفیع اسحاق وردگ، اکرم جاذب، رفعت وحید، سرور فرحان ظہور چوہان، محمد علی ایاز، اسد اعوان، عزم الحسنین عزمی عدنان خالد، احمد محسود، کنور امتیاز احمد	80 تا 145
11	طنز و مزاح	جمیل احمد عدیل، نور کمال شاہ، سیدہ آمنہ ریاض	146 تا 155
12	آپ بیتی	شوکت علی شاہ	156 تا 164
13	تلخ و شیریں	محمد ارشاد	165 تا 181
14	مضامین	محمد رفیق خان، سلمٰی اعوان، شاہدہ دلاور شاہ، محمد نوید مرزا کوثر محمود، ارشد عباس خان، سیدہ آمنہ ریاض عائشہ احمد جاوید، ساجد اقبال	182 تا 218
15	نظمیں	خالد احمد، امجد اسلام امجد، گلزار بخاری، خاور اعجاز شاہنواز زیدی، شبہ طراز، طلعت شبیر، عاطف جاوید عاطف امجد بابر، آسناتھ کنول، منیر احمد فردوس، نائیلہ راٹھور امین کنجاہی، اعجاز رضوی	219 تا 235
16	خطوط	آصف ثاقب، محمد ارشاد، نسیم سحر، رشید آفریں سیدہ آمنہ ریاض، رانا محمد شاہد	236 تا 241

حمد

وہ کہ بے مثل، وہ یکتا، وہ صمد ہے وہ عظیم
ہم نے قرآں میں اسے پایا ہے رحمان و رحیم

ہم نے الحمد سے تا سورۂ والناس پڑھا
اپنے بندوں پہ ہے اس ذات کا الطاف عمیم

وہ تو اس وقت بھی تھا جب نہ تھا پیمانۂ وقت
ماہ و سال اس نے بنا ڈالے ہیں بہرِ تفہیم

حرف کُن اس کے ارادے کے جمالِ زریں
اس کی نظروں میں برابر ہیں جدید اور قدیم

اس کے ہر نام سے وابستہ ہیں اوصاف جلی
وہ مصدق، وہ مصور، وہ ہے دانا، وہ حکیم

ڈوبا سورج بھی پلٹ آیا گواہی کے لیے
معجزہ کہیے کہ تھا حکمِ خداوندِ کریم

چشمے پھوٹے ہیں کہیں گرم، کہیں سرد حسنؔ
اس کی قدرت سے پہاڑوں کا جگر ہے دونیم

حسن عسکری کاظمی

خوش نظر ہے کمال مظہر [حمدیہ نظم]

وہ، جو ہے، خالق
حقیقی خالق
سبھی کا خالق، سبھی کا مالک
نظر سے اوجھل ہے
جتنی مخلوق
ان کا بھی تو وہی ہے خالق
جوان گنت تیرتے خلاؤں میں گم شدہ ہیں
وہ سب کے سب ہیں عجیب حرکت پذیر ایسے
کہ میلوں گہرائیوں سے نیچے
بلند و بالا خلاؤں میں بھی
وجود اپنا سنبھالتے ہیں
سراپا اپنا سنوارتے ہیں
جہان اپنا سدھارتے ہیں
وہ سب کے سب اُس حقیقی خالق کے
دستِ معجز نما ہنر کے
اشاریے ہیں
اسی نے ان کو عجیب دھندوں میں
اس طرح سے لگا دیا ہے
کہ وہ بھی کن کے حسین غمزوں
سے حسنِ ہستی کا جزو اعظم
بنے ہوئے ہیں
وہ حسنِ تخلیق کے معانی کی
خوب ترسیل کر رہے ہیں
یہ اس کی تخلیق کی صفت
کا کمال مظہر ہیں
خوش نظر ہیں

سید ریاض حسین زیدی

حمد

گنتی ہوئی تمام مٹی حد شمار کی
''تعریف کیا کرے کوئی پروردگار کی''

پہلی ہی بار ہو گئی مقبول جب دعا
کیوں عرضِ مدعا کی خطا بار بار کی

لکھ دے جو وہ نصیب میں مکّے کے صبح و شام
رعنائیاں سمیٹ لوں فصلِ بہار کی

ان کو کرے شمار یہ کس کی مجال ہے
جتنی ہیں نعمتیں مرے پروردگار کی

عاصیؔ سنے گا اس کے سوا میری اور کون
حالت بتاؤں کس کو دلِ زار زار کی

مرزا عاصی اختر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

جتنی بار اُس طرف نگاہ اُٹھی
روح تک ہم لرز گئے ہر بار

حمد

حجرۂ دل کو وہ جب نورِ حرا دیتا ہے
حمد کے شعروں کو الہام بنا دیتا ہے

سر پہ ہر شخص کے رکھتا ہے وہ دستِ شفقت
عیب ہر فرد کے دُنیا سے چھپا لیتا ہے

اپنی مخلوق کا ہر حال میں رکھتا ہے خیال
وہ تو پتھر میں بھی کیڑے کو غذا دیتا ہے

کبھی صحراؤں کو پہناتا ہے پھولوں کی ردا
کبھی ویرانوں کو رنگوں کی قبا دیتا ہے

کوئی ڈالی بھی بدن کی نہیں رہتی خالی
شاخِ جاں پر وہ نئے پھول کھلا دیتا ہے

دھوپ میں بوندوں کے ہیروں کو پرو کر اکثر
آسمانوں پہ دھنک رنگ سجا دیتا ہے

پھول اور تتلی میں ہوتی ہیں جو باتیں اکثر
کسی شاعر کی زباں سے وہ سنا دیتا ہے

کبھی بہروں کو بھی دیتا ہے سماعت کی خوشی
کبھی گونگوں کو بھی وہ اذنِ نوا دیتا ہے

تیرگی میں بھی وہ دیتا ہے اُجالوں کی نوید
رات میں چاند کا پیوند لگا دیتا ہے

ٹال دیتا ہے کڑے وقت کو اکثر وہ عقیلؔ
مشکلوں میں وہ ہمیں دستِ دعا دیتا ہے

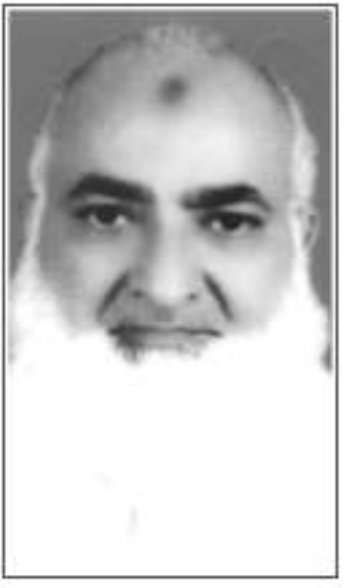

عقیل رحمانی

نعتؐ

طوفان لہو میں برپا ہے قابو نہ دل برباد آئے
جذبات کی شدت افزوں ہے، جب شہرِ مدینہ یاد آئے

ہر لفظ کا نم ہو عشق بھرا، ہو نعت کا محور صلِ علیٰ
جب درد ہو تائب کا دل میں، اظہار لبِ بہزاد آئے

افکار بزرگوں کے تحفے، اوراق نمونے نعتوں کے
تاریخ کھلی تو شاعر کو، اب یاد بہت اجداد آئے

دیدار ہو گنبدِ خضریٰ کا، اے کاش بلاوا آ جاتا
دربار محمدؐ دیکھیں ہم، ہونٹوں پہ یہی فریاد آئے

پُرلطف ہیں طیبہ کے خیمے، پُرکیف ہواؤں کے جھونکے
یہ حال ہے آتے جاتے کا، دل شاد گئے ناشاد آئے

ثاقبؔ یہ کبھی آواز سُنیں، خدمت کا بہت ہے شوق ہمیں
پیغام ملے ہم حاضر ہیں، کچھ حکم کوئی ارشاد آئے

آصف ثاقب

نعتؐ

محوِ حیرت بصر بصر ہے
شاد ہے وہ جسے بھی دیکھو

اُنؐ کے در پر یہ بے ہنر ہے
شہرِ طیبہ عجب نگر ہے

بارگاہِ کرم ہے اُنؐ کی
جس نے پائے رسولؐ چوما

سر جھکائے بشر بشر ہے
یہ جناں کی وہ رہ گزر ہے

وہ رؤفؐ و رحیمؐ و ناصرؐ
جو کھڑا ہے درِ نبیؐ پر

فیض انھی کا ڈگر ڈگر ہے
اے سخنور! وہ تاجور ہے

اُنؐ کی چاہت نفس نفس کو
تُو سراپا گداز ہو جا

اُنؐ کی شیدا نظر نظر ہے
اے مرے دل! یہ اُنؐ کا در ہے

اک عطا ہے قدم قدم پر
دم بدم ہے ثنائے خواجہؐ

مدحتوں کا عجب ثمر ہے
اس سعادت پہ چشم ، تر ہے

سبز گنبد کی چھاؤں میں ہوں
شاید اُنؐ کا پیام آیا

شاخِ امید بارور ہے
ایک خوشبو جو ہمسفر ہے

اُنؐ کے در کا فقیر ہونا
ہے نبیؐ کا دیار ایسا

رفعتِ قسمتِ بشر ہے
سنگریزہ جہاں قمر ہے

روگ دل کو لگے کہ جاں کو
اُنؐ کی رحمت ہی چارہ گر ہے

راہ مدحت کے مرحلوں میں
لطف اُنؐ کا ہی راہ بر ہے

اُنؐ کی یادوں میں جو بہا ہو
اشک کب ہے وہ اک گہر ہے

مشک بُو ہیں فضائیں ہر سُو
آپؐ کے شہر کی سحر ہے

محمد یٰسین قمر

نعتؐ

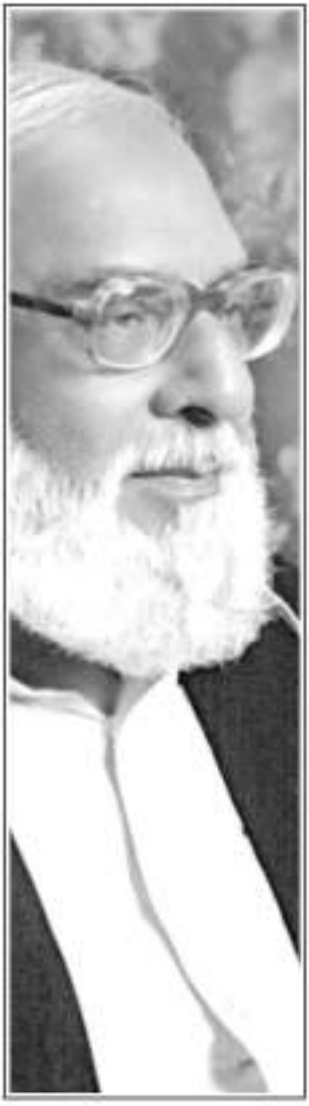

میرا ایماں ہو سلامت زہے قسمت میری
تا ابد زندہ رہے آپؐ سے نسبت میری

دل و جاں جھوم اٹھیں آپؐ کا رستہ دیکھیں
پر جبریل کی پرواز ہو رفعت میری

بگڑی بن جائے اگر آپؐ کے قدموں میں رہوں
فلک آسا مجھے رکھے گی اطاعت میری

آپؐ کی نذر کروں سارے اثاثے اپنے
سرخرو ہوتی رہے ایسے سخاوت میری

آپؐ کی بات سنوں، آپؐ کو ہر دم سوچوں
مستند ہے تو یہی ایک عبادت میری

نور کا ذکر ہوا نور کا منبع چمکا
اے خوشا! ہو گئی پر نور محبت میری

جس طرح آپؐ نے اغیار کو اپنایا ہے
"عفو" کی زندہ علامت ہو مروت میری

ہو ریاضؔ ایسا کہ بس آپؐ کی خوشبو مہکے
گلشن زیست میں کام آئے ریاضت میری

سید ریاض حسین زیدی

نعتؐ

محورِ دو جہاں ہیں میرے حضورؐ
مرکزِ کُن فکاں ہیں میرے حضورؐ

کچھ مکمل نہیں ہے اُن کے بغیر
یعنی کون و مکاں ہیں میرے حضورؐ

جس کی چھتری تلے مکین ہیں ہم
ایسے اِک آسماں ہیں میرے حضورؐ

جانتے ہیں یہ جاننے والے
پسِ ہر لامکاں ہیں میرے حضورؐ

اُنؐ پہ جو ظلم کرنے والے ہیں
اُن پہ بھی مہرباں ہیں میرے حضورؐ

اِس لیے مَیں مدینے جاتا ہوں
کہ وہاں میزباں ہیں میرے حضورؐ

فیض جاری ہے آج بھی اُنؐ کا
جوئے آبِ رواں ہیں میرے حضورؐ

عشق میری زباں سے کہتا ہے
میرا دل، میری جاں ہیں میرے حضورؐ

رب میں اور اس کے پیارے بندوں میں
رابطہ درمیاں ہیں میرے حضورؐ

ہر نفس یہ مرے لبوں پر ہے
جاں ہیں، جانِ جہاں ہیں میرے حضور

وہ یقیں سے بھی ہیں کہیں آگے
ہستیِ بے گماں ہیں میرے حضور

روشنی جس جگہ بھی دیکھی ہے
اُس جگہ ضوفشاں ہیں میرے حضورؐ

اَور کب کوئی اس مقام پہ ہے؟
مُتمکّن جہاں ہیں میرے حضورؐ

پھول پیغام دے رہے ہیں نسیم
بے خزاں گلستاں ہیں میرے حضورؐ

نسیم سحر

نعتؐ

میں ہوں خوش قسمت، مری قسمت ہیں آپؐ
میرا سرمایہ ، مری دولت ہیں آپؐ

آپؐ سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں
رب کی سب سے قیمتی نعمت ہیں آپؐ

دو جہاں ہیں ہاتھ پھیلائے ہوئے
دو جہانوں کے لیے رحمت ہیں آپؐ

کوئی پہنچا ہے ، نہ پہنچے گا جہاں
دو جہاں میں صاحبِ رفعت ہیں آپؐ

آپؐ آئے ہاتھ میں قرآں لیے
یا معلّمؐ! مخزنِ حکمت ہیں آپؐ

ہر نظر کشکول ہو گی روزِ حشر
جب کھلے گا ، شافعِ محشر ہیں آپؐ

میں ، اور اعزازِ بشر ، جانِ انیس!
رب کے، میرے درمیاں نسبت ہیں آپؐ

محمد انیس انصاری

نعتؐ

خود سے مت رکھیے جُدا، ہم کو رسولؐ ہاشمی
اب مدینے لیں بُلا ، ہم کو رسولؐ ہاشمی

معجزہ اپنا دکھا ، ہم کو رسولؐ ہاشمی
اس کرونا سے بچا، ہم کو رسولؐ ہاشمی

حاضری حرمین کی ہو جائے تو دکھلایئے
شام و نجف و کربلا ہم کو رسولؐ ہاشمی

زندگی میں، موت میں، پھر قبر میں اور حشر میں
آپؐ کا ہے آسرا ، ہم کو رسولؐ ہاشمی

ہم تو عشقِ مصطفےٰ میں قطرۂ ناچیز ہیں
قلزمِ اُلفت بنا ، ہم کو رسولؐ ہاشمی

آپؐ چاہیں تو بدل جائے گی سب فردِ عمل
بخش دے گا پھر خدا ، ہم کو رسولؐ ہاشمی

جب سے سینے میں بسا نورِ رسالت آپؐ کا
دل لگے غارِ حرا ، ہم کو رسولؐ ہاشمی

ہے سوا نیزے پہ سورج، پیاس سے بے حال ہیں
جامِ کوثر دیں پلا ، ہم کو رسولؐ ہاشمی

کھیتیاں اعمال کی سُوکھی گناہوں سے عقیلؔ
دے دیں رحمت کی گھٹا، ہم کو رسولؐ ہاشمی

عقیل رحمانی

نعتؐ

دونوں عالم کے خزینے کی طرف کھنچتا ہے
دل مرا مجھ کو مدینے کی طرف کھنچتا ہے

جذبۂ عشق نہیں ڈوبنے دیتا مجھ کو
موج در موج سفینے کی طرف کھنچتا ہے

شہرِ طیبہ تری گلیوں کی مہک کا احساس
کون ہے جو مرے سینے کی طرف کھنچتا ہے

ہجر لمحے مجھے ہرگز نہیں جینے دیتے
اک ترا وصل ہی جینے کی طرف کھنچتا ہے

ایک تیرا ہی تصوّر مرے مکی مدنیؐ
پستیوں سے مجھے زینے کی طرف کھنچتا ہے

لیے جاتا ہے ترا عشق مجھے سوئے حرم
کبھی مکّے سے مدینے کی طرف کھنچتا ہے

مرزا خورشیدؔ مرا حسنِ تخیل مجھ کو
ندرت فن کے قرینے کی طرف کھنچتا ہے

خورشید بیگ میلسوی

نعتؐ

آپ نے جو کہا، اس میں کچھ شک نہیں، اے رسولِ امیں
آپ ہیں بالیقیں، خاتم المرسلیں، اے رسولِ امیں

اپنے اپنے علاقوں، قبیلوں کے تھے، انبیاء و رسل
آپ کی سلطنت، آسمان و زمیں، اے رسولِ امیں

سدرۃ المنتہیٰ تک گئے ساتھ شاہِ ملائک، مگر
آپ کا منتظر تو تھا عرشِ بریں، اے رسولِ امیں

کون سنتا ہے فریاد، کس سے کہیں، اور کیسے کہیں
اے شہِ دوسرا، اے دلوں کے مکیں، اے رسولِ امیں

کیسے خوار و زبوں حال و رسوا ہوئے ہیں، ترے امتی
کیسے بتلائیں، منہ میں زباں ہی نہیں، اے رسولِ امیں

آج طوقِ غلامی گلے میں حمائل ہوا، کل تلک
یہ ترے امتی حکمراں تھے یہیں، اے رسولِ امیں

اکرم ناصر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اک خوشبو سے مہک رہے ہیں آئینہ خانے
زینہ زینہ، نس نس اُتری، چاہت کی مہکار

نعتؐ

ایسا رُتبہ مِرے سرکارؐ کا ہے
ہر زمانہ مِرے سرکارؐ کا ہے

مَیں ہُوں مصروف طواف کعبہ
اور کعبہ مِرے سرکارؐ کا ہے

عشق منزل ہے مِرے آقاؐ کی
عقل رستہ مِرے سرکارؐ کا ہے

یہی فردوسِ بریں ہے مجھ کو
یہ جو روضہ مِرے سرکارؐ کا ہے

دل کی نگری کا نہ پوچھو خاورؔ
قریہ قریہ مِرے سرکارؐ کا ہے

خاور اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کس کے عشق کا سورج چمکا، کیسی رُت آئی
ایک ہی سمت اُڑے جاتی ہے کونجوں کی ہر ڈار

نعتؐ

کیسے وہ بیانِ لب و رخسار میں آوے
جو لطف کہ مدحِ شہِ ابرار میں آوے

اس گنبدِ خضرا کا جو باندھوں میں تصور
اک نور کا پرتو مرے اشعار میں آوے

سمجھوں گا کہ اب نعت ثمر بار ہوئی ہے
سیرت کی جو خوشبو مرے کردار میں آوے

ملتی ہی نہیں اور کسی ذکر میں ہم کو
تسکین جو اس نام کی تکرار میں آوے

وہ اسمِ گرامی جو ادا ہووے زباں سے
شیرینی بھلا کیسے نہ گفتار میں آوے

لگتا ہے سرِ شاخ مہک اٹھا ہے غنچہ
وہ حرف جو مدحت کے سخن زار میں آوے

اس دل پہ تصدق ہوئے جاتے ہیں فرشتے
بکنے جو ترے کوچہ و بازار میں آوے

بن جائے گا بخشش کا وسیلہ سرِ محشر
آنسو جو وہاں چشمِ گنہ گار میں آوے

اک لہر میں آتے ہیں گل و شبنم و خوشبو
طیبہ کی ہوا جیسے ہی گلزار میں آوے

لے جائے مجھے بزمِ حضوری میں جو سرورؔ
کچھ ایسا قرینہ مرے اظہار میں آوے

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

وارث دو جہاں ، حضور کی ذات
مرکزِ این و آں ، حضور کی ذات

درد مندوں کا آسرا وہ ہیں
راحتِ انس و جاں حضور کی ذات

بے قراری میں ، نارسائی میں
ہے لبوں کی فغاں حضور کی ذات

اس زمانے کی بے ثباتی میں
رحمتِ بے کراں حضور کی ذات

ذکرِ صلی علیٰ کی رونق ہے
ذی حشم ، ذی نشاں حضور کی ذات

آپ کے فیض سے جہاں روشن
روشنی کا جہاں حضور کی ذات

کھل گئے دل کے بند دروازے
میرے دل میں نہاں حضور کی ذات

ہر جگہ ہے ندیم فیضِ رسولؐ
ہر گھڑی میں رواں حضور کی ذات

ندیم عباس اشرف

نعتؐ

حبیبِ خدا ہیں وہ صادق امیں ہیں گماں سے یقیں تک
وہ حاجت روا ہیں وہ روشن جبیں ہیں گماں سے یقیں تک

عطا ہی عطا ہیں یقیں ہی یقیں ہیں گماں سے یقیں تک
ہر اِک نعت خواں کے وہ دل میں مکیں ہیں گماں سے یقیں تک

اُنہی کی نبوت کا گونجا ہے سارے جہاں میں ترانہ
نبوت کا بے شک وہ ایسا نگیں ہیں گماں سے یقیں تک

ازل سے ابد تک کوئی اُن کا ثانی ہوا ہے نہ ہو گا
وہ سب سے حسیں ہیں وہ سب سے حسیں ہیں گماں سے یقیں تک

عطا مجھ کو اِذنِ حضوری ہو طیبہ سے واپس نہ آؤں
بجز اِس کے ارمان دل میں نہیں ہیں گماں سے یقیں تک

نہیں کوئی بعد اُن کے آیا نبی اور نہ آئے گا شہزادؔ
نبی آخری ، خاتم المرسلیں ہیں گماں سے یقیں تک

شہزاد احمد شیخ

نعتؐ

محمود کیفی

نبیؐ کے عشق میں ایسا دِکھائی دیتا ہے
جسے بھی دیکھوں وہ اپنا دِکھائی دیتا ہے

حضورؐ یاد کی صُورت یہاں بھی رہتے ہیں
مجھے تو دِل بھی مدینہ دِکھائی دیتا ہے

مُحبِّ سرورِ کونینؐ جِس طرف دیکھے
خُدا کے نُور کا جلوہ دِکھائی دیتا ہے

بسی ہو دِل میں مہک عشقِ مُصطفےؐ کی اگر
جہان سارا ہی مہکا دِکھائی دیتا ہے

کمالِ مِدحتِ سرور، کہ میری قسمت کا
عُروج پر ہی سِتارہ دِکھائی دیتا ہے

ضرور اُس کو ہے نِسبت حضُورؐ سے کیفی
جو قول و فعل میں سچّا دِکھائی دیتا ہے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خالد احمد تری نسبت سے ہے خالد احمد
تو نے پاتال کی قسمت میں بھی رفعت لکھی

عقیدت

پروردہء شاہِ زمن، مولا حسنؓ مولا حسن
حسنِ بہارِ پنجتن، مولا حسنؓ مولا حسنؓ

کیسے بیاں ہو مرتبہ، نورِ نگاہِ سیدہؓ
شہزادۂ خیبر شکن، مولا حسنؓ مولا حسنؓ

گفتار میں بھی نرم خو، کردار میں بھی امن جو
رشکِ زماں جن کا چلن، مولا حسنؓ مولا حسنؓ

اے راکبِ دوشِ نبیؐ، اے مظہرِ شانِ علیؓ
اے گل مزاج و گل بدن، مولا حسنؓ مولا حسنؓ

نورِ نبیؐ کی روشنی، زہراؓ سے جو آگے چلی
اس نور کی پہلی کرن، مولا حسنؓ مولا حسن

رشکِ جناں رشکِ فلک، چہرے پہ تھی ایسی چمک
سب سے جدا جس کی پھبن، مولا حسنؓ مولا حسنؓ

باندی رہے بس آپ کی، خادم رہے بس آپ کا
مری نوا میرا سخن، مولا حسنؓ مولا حسنؓ

ہرگز نہیں ہے شاعری، یہ ہے بیانِ دلبری
کیا خوب ہے مشقِ سخن، مولا حسنؓ مولا حسنؓ

سرورؔ زباں جب یہ کہے، غم کوئی پھر کیسے رہے
مولا حسنؓ مولا حسنؓ مولا حسنؓ مولا حسنؓ

سرور حسین نقشبندی

رباعیات

حق بزبانِ حق

دن ہو یا رات قل ھو اللہُ احد — اللہُ الصمد پکار اللہُ الصمد
ممکن نہیں کوئی ایک بھی کفو اس کا — او لَم یلد اَست و نیز ہم لَم یُولَد

اِنّا اعطینٰکَ الکوثر اے دوست — پس تُو اَقِم الصلوٰۃَ وَانحَر اے دوست
آرے وَرَفَعنا لَکَ ذِکرَک خوش باش — بے شک ترا دشمن ہی ہے ابتر اے دوست

سینہ ترا کیا کیا نہیں چاک اے دوست — تا تُو بشوی پاک ترا اَز پاک اے دوست
تُو میرا اور ترے سوا سب تیرا — لَو لاکَ لَما خَلَقتُ الافلاک اے دوست

حق بزبانِ حق

ہے کون و مکاں پہ اے نبی تیرا راج — نعلین ترے سرِ ملائک کو تاج
فی دینِ اللہِ یدخلُون الاَفواج — تسلیم ہے باج تصلیہ نیز خراج

ہے جس پہ درود اَمرِ مؤکد تو ہے — اللہ احد ہے اور اوحد تو ہے
واجب ہے خدا کی حمد مجھ پر بھی پہ میں — کرتا ہوں تری حمد محمد تو ہے

نُورے کاں را بلند و پست است آماج — زد چاک بتا روپود ہائے شبِ داج
قوسین نے دائرے کی کر دی تکمیل — آدم بہبوط و مصطفےٰ با معراج

پر سید از من منتہیِ علمِ نجوم — خورشید؟ احمد! تو ہفت کوکب؟ معلوم
قاسمؐ، طاہر (عبدُاللہ) ابراہیمؐ — زینبؓ ، زہراؓ ، رُقیہؓ، اُم کلثومؓ

اے مادحِ گلبنِ محمدؐ مت بھول — بُن ایک ہے اور سات مبرہن ہیں پھول
قاسمؐ، طیبؓ (عبداللہ) ابراہیم — زینبؓ ، رُقیہؓ، اُم کلثومؓ، بتولؓ

ممکن ہوتا تو بات کو دیتا طول — ہے رخصتِ گفتار علیٰ قدرِ عقول
ہے صاحب معراج فقط اک سو وہی — اللہ کا آخری نبی اور رسولؐ

محمد ارشاد

قطعات

جاتے جاتے کر گیا یہ جور سال
زندگی کا کم ہوا اک اور سال
کمسنی کا حسن ارمانِ شباب
لے گیا ہے ساتھ کتنے دور سال

.....

گلاب لمحے بنے ہیں عذاب کی صورت
دکھائی دیتی ہے دنیا سراب کی صورت
مہک رہے ہیں ابھی تک گئی رتوں کے چمن
مرے خیال کی بستی میں خواب کی صورت

.....

نذرانۂ دل دیتے جب بزم میں ہم آتے
لے کر تیرے وعدوں کے سب رنگ بہم آتے
تُو چاہے بُلا لیتا اغیار کی محفل میں
رکھنے کو بہر صورت ہم تیرا بھرم آتے

.....

حشر برپا ہو اگر دل میں تمنا نہ رہے
ختم ہو جائے محبت تو یہ دنیا نہ رہے
اُس کی یادوں کا اجالا ہے ہمارے دل میں
تنہا ہو کے بھی بہت ہم کبھی تنہا نہ رہے

.....

کتنا گہرا زخم تھا ہنس کر جو دل پر سہہ گیا
ہر گزرتا لمحہ غم کی بات اُس سے کہہ گیا
وہ بہت زیرک تھا لیکن اُسکا غربت کے سبب
لکھنے پڑھنے کا ہر اک سپنا ادھورا رہ گیا

طاہر ناصر علی

ہائیکو

آج ساون کی پہلی بارش تھی
ایک شعلہ بدن کی قربت میں
بھیگتا جا رہا ہے آتشدان

اور کوئی سزا نہیں درکار
باد صرصر کی جھیل کافی ہے
خشک پتے کو ڈوبنے کے لیے

اور تو کچھ نہیں ہُوا ہوگا
ہاتھ سورج کا چُوم لینے میں
شام کے ہونٹ جل گئے ہوں گے

جھیل کی بات کون سُنتا ہے
لوگ تو اُس کے پہلو میں ہر شام
صرف پکنک منانے آتے ہیں

چاندنی میں نہا رہی تھی رات
اور جگنو دعائیں کرتا تھا:
کاش لمحہ یہیں ٹھہر جائے

خاور اعجاز

دوہے

طوفانوں کے خوف سے بیٹھ نہ ہمت ہار
مجھکو اے مانجھی مرے لے چل ندیا پار

☆

ہم دونوں کے پیار کے بگڑے سارے کھیل
ساجن کو لیکر گئی چھک چھک کرتی ریل

☆

لے لے کر میں شام سے بھابھی جی کی آڑ
ٹھینگا دکھلاؤں اُنہیں اُنکی نیت تاڑ

☆

آتے جاتے آج بھی دیکھوں اُسکی اور
گنے کے جس کھیت میں ناچے تھے دو مور

☆

اُبکائی نے کھول دی میری ساری پول
دیور ناچے بھانگڑا نندی پیٹے ڈھول

☆

لیکر لوٹا بالٹی جاؤں میں کس اور
بیٹھے ہیں ہر موڑ پر رنگ رُوپ کے چور

☆

دیکھے مجھ کو گھور کر بولے میٹھے بول
لگتی ہے نیت مجھے اُسکی ڈانواڈول

نیاز جیراجپوری

ملی نغمہ

منظور ثاقب

مرے وطن کی زمینوں کی خیر ہو مولا
مری زمیں کے مکینوں کی خیر ہو مولا

جو اس میں بہتے ہیں دریا وہ بہتے ہی جائیں
جو پھول پھل یہاں اگتے ہیں اگتے ہی جائیں
یہاں کے جنگل و صحرا نکھرتے ہی جائیں
یہاں کے سارے دفینوں کی خیر ہو مولا
مرے وطن کی زمینوں کی خیر ہو مولا

یہاں جو بستے ہیں بستے رہیں زمانوں تک
خوشی سے چہرے دمکتے رہیں زمانوں تک
قدم قدم پہ وہ بڑھتے رہیں زمانوں تک
جواں سپوتوں کے سینوں کی خیر ہو مولا
مرے وطن کی زمینوں کی خیر ہو مولا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چاک داماں کیا ہوا؟ وہ حشر ساماں کیا ہوا؟
اے بیاباں! وہ غبارِ کوئے جاناں کیا ہوا؟

پرپوزل

پیروز بخت قاضی

وہ لاہور ایئر پورٹ پہنچا تو وہاں بڑا رش تھا۔ تین چار جہازوں کی آمد و رفت چند منٹوں کے اندر ہونی تھی۔ ڈومیسٹک سروس میں دو فلائٹس تھیں اسلام آباد سے آنے والا ایک جہاز لینڈ کر چکا تھا، جس کے مسافر تھوڑی دیر میں کلیئرنس ہال میں پہنچنے والے تھے۔ ایک جہاز کو تھوڑی دیر بعد ملتان کے لیے روانہ ہونا تھا۔ انٹرنیشنل فلائٹ جو دوبئی سے آئی تھی تھوڑی دیر پہلے پہنچی تھی جس کے مسافروں نے باہر آنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے ساتھ آنے والے سامان کی بھرمار تھی اور ان میں سے ایک ایک مسافر کو لینے کے لیے پورا پورا خاندان اور احباب کے جھمگٹے آئے ہوئے تھے۔ باہر ہال میں مسافروں سے زیادہ ریسیو Receive کرنے والوں اور سی آف See Off کرنے والوں کا ہجوم تھا۔ اسباب کی ٹرالیاں مستزاد تھیں۔ ہال کے فرش پر سگریٹوں کے بجھے ہوئے ٹوٹے، کاغذوں کے پرزے سگریٹ کی خالی ڈبیاں، جوس کے خالی پیکٹ، ٹافیوں اور دل سویٹوں کے ریپرز اور پھلوں کے چھلکے جا بجا بکھرے

پڑے تھے۔ حالات کسی ریلوے سٹیشن یا بسوں کے اڈے سے بھی ابتر تھے۔

اس کے ہاتھ میں صرف ایک بریف کیس تھا، اور کوئی سامان نہ تھا۔ اس لیے وہ جلدی ہی سکیورٹی کلیرنس کرا کے اور بورڈنگ کارڈ لے کر ویٹنگ لاونج میں پہنچ گیا۔ ایک صوفے پر بیٹھ کر اس نے اپنا بریف کیس کھولا اور ایک میگزین نکال کر پڑھنے لگا۔ میگزین کھولتے ہی اس کی نظر ایک اشتہار پر پڑی، جس میں ایک خوش لباس نوجوان کسی برانڈ کا سگریٹ ہونٹوں میں لیے ہوئے تھا اور ایک دلکش خاتون لائٹر کا شعلہ اس کے قریب لے جا رہی تھی تاکہ وہ شخص اپنا سگریٹ سلگا لے۔ اس سے آگے امریکہ کے صدارتی انتخابات پر ایک رپورٹ چھپی تھی، جس میں صدارتی امیدواروں کی تصویریں اور کوائف چھاپے گئے تھے۔ چند اوراق الٹنے پر ایک اشتہار دو صفحوں پر شائع ہوا تھا جس میں ایک نوجوان مرد اور ایک دلکش حسین عورت کو بیڈنگ کا سٹیوم میں دکھایا گیا تھا۔ مختلف پوزوں میں جوڑے کی تین چار تصاویر دی گئی تھیں جن میں مختلف قسم کے مردانہ جانگیے اور زنانہ ہائی کنیر پہنائی گئی تھیں۔ اس کے آگے انٹرنیشنل سیکشن میں مختلف ممالک کے واقعات کی رپورٹنگ کی گئی تھی۔

وہ ابھی یہاں تک پہنچا تھا کہ اعلان ہو گیا کہ ملتان جانے والا جہاز تیار ہے، مسافر گیٹ نمبر دو کے راستے باہر نکل کر جہاز کی سمت جائیں۔ اس نے میگزین بریف کیس میں بند کیا اور اُٹھ کر لائن میں کھڑا ہو گیا۔ جہاز گیٹ کے قریب ہی کھڑا تھا، اس لیے مسافر پیدل ہی جہاز تک پہنچ کر سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ لائن میں اس سے آگے ایک نوجوان خاتون کھڑی تھی، جس نے چھ سات ماہ کا ایک خوبصورت اور صحت مند بچہ گود میں اُٹھا رکھا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں ٹیوب روزز کے ڈنٹھلوں کا بڑا سا بنڈل پکڑ رکھا تھا۔ بازو میں وینٹی بیگ کے علاوہ پلاسٹک کا ایک اور تھیلا بھی لٹکا رکھا تھا۔ اس کے لیے سب چیزیں سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا جبکہ بچہ بھی اس کے بازو میں ہمک ہمک کر جھول رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر خاتون اور اس کے بچے کو دیکھتا رہا اور جلدی ہی اس نے محسوس کر لیا کہ خاتون کے لیے اپنی سب چیزیں سنبھالنے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ یہ خیال آتے ہی اس نے خاتون سے ٹیوب روزز کا بنڈل اور پلاسٹک کا تھیلا لے لیا۔ جہاز کے اندر پہنچ کر اس نے پہلے خاتون کو اس کی نشست پر پہنچایا۔ پھولوں کا بنڈل اور تھیلا سیٹ کے

اوپر لگے لگیج شیلف میں رکھا۔ پیشتر اس کے کہ وہ اپنی سیٹ کی طرف بڑھتا خاتون نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد روانگی کا اعلان ہوا اور پھر جہاز رن وے پر دوڑنے لگا۔ رن وے کے دوسرے سرے پر سے جہاز نے ٹیک آف کیا اور ہوا کے دوش پر بلندیوں کی طرف پرواز کر گیا۔ وہ اپنی سیٹ پر بیٹھا اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا جب فضائی میزبان نے چائے اور کافی کی سروس شروع کر دی۔ کافی پی گئی۔ برتن اُٹھائے گئے اور پھر چند منٹوں کے بعد اعلان ہوا کہ جہاز ملتان ایئر پورٹ پر لینڈ کرنے والا ہے۔ ٹیوب روزز والی خاتون اور اس کا بچہ راہداری کی دوسری طرف اپنی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ ماں بچے کا فیڈر تھیلے میں ڈال کر بند کر رہی تھی اتنے میں جہاز نے شہر کے اوپر فضا میں ایک چکر لگایا اور زمین سے اس کی بلندی کم ہوتی گئی بالآخر جہاز ملتان ایئر پورٹ پر لینڈ کر گیا اور ٹیکسی کرتا ہوا ایئر ٹرمینل کے پاس پہنچ کر رک گیا۔ مسافر اترنا شروع ہو گئے۔ بچے والی خاتون انتظار کر رہی تھی کہ بھیڑ کم ہو اور وہ باہر کی طرف روانہ ہو۔ وہ اپنا بریف کیس پکڑ کر آگے بڑھا اور خاتون سے مخاطب ہوا ''اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کی کچھ مدد کروں۔''

''پلیز ڈواٹ'' وہ بولی۔

اس نے ٹیوب روزز اور پلاسٹک کا تھیلا پکڑ لیا اور وہ دونوں جہاز کی سیڑھیاں اتر کر ٹرمینل کی طرف چل پڑے۔

''میرے میاں کو بلیک فاریسٹ کیک بہت پسند ہے اور مجھے ٹیوب روزز۔ دونوں چیزیں ملتان میں دستیاب نہیں ہیں اس لیے میں لاہور سے لے آئی ہوں آپ کو میں نے خواہ مخواہ تکلیف دی ہے۔''

''ہرگز نہیں! بلکہ یہ میرے لیے باعث مسرت ہے..... آپ ملتان میں رہتی ہیں؟

''جی ہاں! میرے میاں فوج میں ہیں اور آجکل انکی پوسٹنگ ملتان ہے۔''

''لگیج ہال میں خاتون نے ٹرالی لے کر ٹیوب روزز کے پھول اور پلاسٹک کا بیگ اس میں رکھ لیے اور کنویئر بیلٹ کی طرف بڑھی جہاں اس نے اپنا سوٹ کیس لینا تھا۔ خاتون نے اس کا شکریہ ادا کیا اور وہ اپنا بریف کیس لیے ٹرمینل سے باہر آ گیا جہاں اس کے محکمے کا نمائندہ موجود تھا۔ وہ اس کے ہمراہ دفتر گیا جہاں اس کا عملہ تین روز پہلے سے آیا ہوا اور تفصیلی انسپکشن کر چکا تھا۔ اس نے انسپکشن کے دوران اُٹھنے والے خاص خاص نکات پر ملتان والوں سے تبادلہ خیالات کیا، رپورٹ میں ترمیم و اضافہ کیا اور رپورٹ کا فائنل

ڈرافٹ تیار کیا۔ وہاں سے فارغ ہوکر وہ سیدھا ریلوے سٹیشن چلا گیا۔ ریلوے انکوائری سے پتہ چلا کہ کوئٹہ ایکسپریس پلیٹ فارم پر کھڑی ہے اور تھوڑی دیر میں کوئٹہ کے لیے روانہ ہوگی۔ اس نے جلدی سے فرسٹ کلاس سلیپر کا ٹکٹ خریدا اور پلیٹ فارم پر کھڑی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ کنڈیکٹر نے اس کا نام دریافت کیا اور بوگی اور سیٹ نمبر دیا۔ وہ ریل کے ڈبہ میں سوار ہوا، مطلوبہ کوپے میں پہنچ اور اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

کوپے میں اس کے علاوہ تین اور مسافر سفر کر رہے تھے۔ ایک صاحب بالائی برتھ پر سو رہے تھے، دو سکھ میاں بیوی تھے۔ دونوں پڑھے لکھے مہذب اور صاف ستھرے لباس میں ملبوس تھے۔ سکھ مرد نے پتلون قمیض پہن رکھی تھی اور سر پر اودے رنگ کی پگڑی باندھ رکھی تھی۔ اس کی بیوی نے شلوار قمیض اور دوپٹہ پہن رکھا تھا۔ وہ خالص پنجابی عورت تھی اور اس کی شکل، لباس اور بات چیت سے لگتا تھا کہ اس کا تعلق ہمارے اپنے ملک کے کسی پنجابی خوشحال گھرانے سے ہے۔

''آپ کوئٹہ جائیں گے؟'' سردار جی نے دریافت کیا۔

''نہیں میں تقریباً ڈیڑھ سو میل تک سفر کر کے خانپور اُتر جاؤں گا۔ آپ کوئٹہ جا رہے ہیں؟''

''ہمارا تو سارا دن اور ساری رات کا سفر ہے'' سردار جی نے جواب دیا اور پھر مزید وضاحت کرتے ہوئے متوقع سوالات کا خود ہی جواب دے دیا۔ 'دراصل ہم ایران جا رہے ہیں، ہم نے سوچا کہ ہوائی جہاز کے بجائے ریل گاڑی کا سفر کریں تو سارا علاقہ دیکھنے کا موقع مل جائے گا۔''

''ایران کی سیاحت کریں گے؟'' اس نے دریافت کیا۔

''نہیں دراصل ہم ایران کے شہر تہران میں رہتے ہیں۔ رشتہ داروں سے ملنے دلی گئے تھے اور اب واپسی ہے'' سردار جی نے بتایا۔

''وہاں کوئی ملازمت ہے یا کاروبار؟''

''ہمارا اپنا کاروبار ہے تہران ہے۔'' سردار جی بولے۔

''دراصل ان کے پتا جی کے زمانے کا تہران میں کاروبار ہے'' سردار جی کی پتنی نے وضاحت کی۔

''اچھا تو آپ لوگوں کا ایران میں عرصہ سے قیام ہے۔'' وہ بولا۔

''میرے والد ہندوستان کی آزادی سے بہت پہلے ایران چلے گئے تھے اور وہیں آباد ہو گئے تھے۔ میری پیدائش بھی تہران کی ہے لیکن میری بیوی دلی کی رہنے والی ہیں

اور وہیں پیدا ہوئی تھیں۔ کوئی دس برس قبل ہماری شادی ہوئی تھی، جس کے بعد یہ دلی سے تہران منتقل ہو گئیں۔ ان کے والدین اور بہن بھائی اب بھی دلی میں ہوتے ہیں۔ ہم ان کو ملنے تہران سے دلی گئے۔ دو ماہ ہم نے بھارت میں قیام کیا۔ وہاں دلی کے علاوہ ہم دربار صاحب امرتسر بھی گئے۔ امرتسر سے لاہور پہنچے جہاں ہم نے تقریباً دو ہفتے قیام کیا۔ اس دوران مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سمادی، ننکانہ صاحب اور حسن ابدال میں پنجہ صاحب کی یاترا کی۔ اسلام آباد، راولپنڈی اور لاہور کی سیر کی اور اب بذریعہ ٹرین کوئٹہ جا رہے ہیں۔ وہاں دو تین روز قیام ہوگا وہاں سے ٹرین میں براستہ کوہ تفتان، زاہدان ایران جائیں گے اور تہران اپنے گھر پہنچیں گے۔''

''بھارت میں سکھوں کے حالات اب کیسے ہیں؟''

''اچھے نہیں ہیں۔ اندرا گاندھی نے سکھوں پر بہت ظلم کیا اور مذہبی بنیادوں پر انھیں نشانہ بنایا۔ دربار صاحب امرتسر دنیا بھر میں سکھوں کا سب سے مقدس مقام ہے۔ اندرا گاندھی نے وہاں فوج کشی کر کے گولیاں چلائیں، گولے برسائے اور سکھوں کے مذہبی رہنماؤں کو شہید کیا۔ نوکریوں کے دروازے سکھوں کے لیے بند ہوتے جا رہے ہیں اور سماج میں ان سے بدسلوکی بدن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔''

''شاید اسی وجہ سے اندرا گاندھی سکھ محافظوں کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچیں۔'' اس نے رائے ظاہر کی۔

''نہیں یہ بالکل غلط ہے کہ سکھوں نے اندرا گاندھی کو مروایا۔ یہ راجیو گاندھی کا پراپیگنڈا ہے۔ دراصل راجیو گاندھی حکومت اپنے ہاتھوں میں لینے کے لیے بے چین تھا۔ اور اپنی ماں کو راستے سے ہٹائے بغیر وہ راج پاٹ نہیں سنبھال سکتا تھا۔ اس لیے اس نے اندرا کر مروا دیا اور خود حکومت پر قابض ہو گیا عوام میں اپنے لیے ہمدردی پیدا کرنے کے لیے اس نے اندرا کے قتل کا الزام سکھوں پر تھوپ دیا۔ قبل ازاں راجیو نے اپنے بھائی سنجے کو بھی ٹھکانے لگایا تھا جو سیاست میں متحرک تھا اور جس کے اندرا کا جانشین بننے کے زیادہ امکانات تھے۔ اب راجیو دونوں ہاتھوں سے ملک کی دولت سمیٹ رہا ہے۔'' سردار جی نے اپنا نکتہ نظر بیان کیا۔

اردو بولتے بولتے سردار جی اور ان کی پتنی پنجابی میں باتیں کرنے لگے۔ اب وہ زیادہ سہولت اور بے تکلفی سے گفتگو کر

رہے تھے۔ سردار جی کی پتنی کہنے لگیں کہ بھارت میں پنجاب سے نیچے جائیں تو پنجابی بولنے والا کوئی نہیں ملتا۔ بلکہ پنجاب اور ہریانہ میں بھی جو پنجابی بولی جاتی ہے اس میں ہندی اور سنسکرت کے لفظوں کی بھرمار ہوتی ہے - یہاں پاکستان میں آکر ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ سب لوگ اپنے ہیں۔ اپنے جیسی بولی، اپنے جیسا لباس اور اپنے جیسی شکل و صورت۔ بڑی اپنائیت لگتی ہے۔

''اگر سردار جی کے کیس اور ان پر پگڑی نہ ہوتی تو کون کہہ سکتا تھا کہ آپ سکھ ہیں اور غیر ملکی ہیں۔ اور بہن جی آپ تو لاہور کی رہنے والی لگتی ہیں۔ کہیں سردار جی آپ کو لاہور سے تو ہمراہ لے کر نہیں جا رہے؟ اس پر سب کھلکھلا کر ہنس دیئے۔

''سردار جی تو مجھے دلی سے بیاہ کر ایران لے گئے تھے لیکن میرے بزرگ لاہور کے آس پاس غالباً گوجرانوالہ کے باسی تھے۔''

''میں ضلع اٹک میں تعینات رہا ہوں اور حسن ابدال میرے علاقہ میں پڑتا تھا۔ اس لیے جب سکھ یاتری حسن ابدال آتے تو میں ان کے سواگت کے انتظامات کا جائزہ لینے کے لیے وہاں ضرور جاتا تھا - ایک بار گردوارہ پربندھک کمیٹی کے ارکان صدر ضیا الحق کی دعوت پر پاکستان آئے تھے اور وہ حسن ابدال میں پنجہ صاحب کی یاترا کے لیے بھی گئے تھے ان میں ماسٹر تارا سنگھ کی سپتری بھی اپنے شوہر سمیت شامل تھیں۔ وہ ان دنوں بھارت کی راجیہ سبھا کی ممبر تھیں اور ان کے شوہر انڈین ایئر فورس سے بطور ونگ کمانڈر ریٹائر ہوئے تھے۔ بھارت میں اس وقت اندرا گاندھی کی حکومت تھی۔ انھوں نے بھی یہی بات کہی تھی جو آج آپ نے کہی ہے۔

انھوں نے کہا تھا ''جب میں راجیہ سبھا کی میٹنگ کے لیے دلی جاتی ہوں تو دوسرے ممبران سے ملاقات کر کے مجھے اجنبیت کا احساس رہتا ہے مدارس، بمبئی، کلکتہ، بنگلور وغیرہ سے جو ممبر پارلیمنٹ آتے ہیں وہ نہ میری زبان سمجھتے ہیں نہ میں ان کی۔ ہماری شکلیں، لباس، خوراک، زبان سب الگ الگ ہوتے ہیں۔ ہم آپس میں انگریزی بول کر بات سمجھاتے ہیں۔ لیکن جب میں نے واہگہ بارڈر پار کیا تو مجھے سب کچھ اپنا ہی لگا۔ اپنے جیسے لوگ، اپنی بولی، اپنا لباس، اپنا کلچر، میں نے سوچا یہ سرحدیں اور بارڈر سب مصنوعی ہیں جنھوں نے ہم پنجابیوں کو تقسیم کر دیا ہے۔''

میں نے جواب دیا تھا ''ہمارے قائد

اعظم نے تو سکھوں کو مشورہ دیا تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ پاکستان میں رہیں اس صورت میں پنجاب بھی تقسیم نہ ہوتا۔ انھوں نے سمجھایا تھا کہ مسلمان اور سکھ مذہبی طور پر بھی زیادہ قریب ہیں کیونکہ دونوں توحید پرست ہیں اور خدائے واحد کو مانتے ہیں جبکہ ہندوؤں کے کئی خدا ہیں اور وہ بتوں کی پوجا کرتے ہیں۔ گورونانک سکھ مذہب کے بانی ہیں اور مسلمان بھی گورونانک کا احترام کرتے ہیں لیکن پتہ ہے اس وقت آپ کے پتا جی ماسٹر تارا سنگھ نے قائداعظم کا مشورہ رد کردیا تھا اور ہندو کانگریس کا ساتھ دیا تھا اس کے نتیجے میں پنجاب تقسیم ہوگیا اور ہندوؤں نے سکھوں سے اپنا مطلب نکال کر انھیں دوسرے درجہ کا شہری بنادیا۔''

''یہ تو آپ نے بالکل درست کہا۔ تقسیم کے وقت سکھ لیڈر شپ نے بہت بڑی غلطی کی تھی جس کا خمیازہ سکھ آج تک بھگت رہے ہیں'' سردار جی اور ان کی پتنی یک زبان ہوکر بولے۔

''جہاں تک ایک زبان یا کلچر یا مذہب کی بات ہے تو آپ دیکھیں عرب ایک قوم ہیں۔ ان کی نسل، زبان، کلچر، مذہب ایک ہے لیکن عرب قوم درجنوں ملکوں اور ریاستوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اسی طرح اینگلو سیکسن نسل کے لوگ جن کی مادری زبان انگریزی ہے وہ کئی قوموں اور ملکوں پر مشتمل ہیں جیسے برطانیہ، امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ سب علیحدہ ریاستیں ہیں۔''

''یہ تو ٹھیک کہا آپ نے'' سردار جی نے سر ہلا کر کہا۔

''یہ تو کسی قوم کی مرضی اور انڈرسٹینڈنگ کی بات ہے۔ برطانیہ سے جا کر لوگ امریکہ میں آباد ہوئے لیکن انھوں نے برطانیہ کے ساتھ جنگ کر کے آزادی حاصل کی۔ اس کے برعکس سوئٹزر لینڈ میں فرنچ، جرمن اور اٹالین زبانیں بولنے والے آباد ہیں لیکن وہ آپس میں مل کر صدیوں سے ایک قوم بن کر رہ رہے ہیں۔ وہ منتشر ہوکر جرمنی، اٹلی یا فرانس میں ضم نہیں ہونا چاہتے۔''

''یہ بھی درست کہا آپ نے۔ جیسے افغانستان کے شمال مغربی علاقہ میں فارسی بولی جاتی ہے۔ ان کا مسلک بھی شیعہ ہے جن کی ایران میں واضح اکثریت ہے لیکن فارسی بولنے والے افغان ایران میں شامل نہیں ہونا چاہتے بلکہ افغانستان کا حصہ بن کر رہنا چاہتے ہیں'' سردار جی نے ایک اور مثال پیش کردی۔

''اب یہی ہے کہ بھارت اور پاکستان کو

اچھے ہمسایوں کی طرح رہنا چاہیے اور بھارت میں اقلیتوں کے حقوق کی اسی طرح پاسداری ہونی چاہیے جیسے پاکستان میں کی جاتی ہے چاہے معاملہ سکھوں کا ہو، مسلمانوں کا ہو یا عیسائیوں کا۔ بھارت کو تھوڑی سی اپنی سوچ بدلنی چاہیے اور متنازعہ ریاست جموں و کشمیر میں لوگوں کو استصواب رائے کا حق دینا چاہیے جس کا وعدہ بھارت اور پاکستان دونوں نے کیا تھا اور جس کا اعادہ اقوام متحدہ کی کئی قراردادوں میں ہو چکا ہے۔''

انھیں باتوں میں وقت پر لگا کر اڑتا گیا۔ لودھراں، بہاولپور، سمہ سٹہ، ڈیرہ نواب صاحب اور لیاقت پور کے سٹیشن گزر چکے تھے۔ خانپور جنکشن آنے والا تھا۔ اس نے سردار جی اور سردارنی کو الوداع کہا اور خانپور سٹیشن پر گاڑی سے اُتر گیا۔

خانپور میں چند روز قیام کے بعد وہ واپس لاہور کے روانہ ہوا۔ اس مرتبہ خانپور سے ملتان تک اس نے کار میں اپنے عزیز کے ہمراہ سفر کیا جو اسے ملتان ایئرپورٹ پر چھوڑ گیا۔ جب وہ اندر بورڈنگ کارڈ لینے کے لیے کاؤنٹر پر پہنچا تو اس کے پیچھے وہی خاتون اپنے پیارے سے بچے کو اُٹھائے آ گئی۔ اس مرتبہ اُس کے ہاتھ میں نہ تو ٹیوب روزز کا بنڈل تھا اور نہ پلاسٹک کا تھیلا۔ بس اس کا وینٹی بیگ تھا اور گود میں بچہ۔ دونوں نے ایک دوسرے کو سلام کیا، بورڈنگ کارڈ حاصل کیے۔ خاتون کا سوٹ کیس ٹیگ لگنے کے بعد کانویئر پر آگے چلا گیا اور وہ دونوں ویٹنگ لاؤنج میں آ گئے۔

''عجب اتفاق ہے آج پھر ہم سفر ہوں گے۔''

''جی ہاں، لیکن آج آپ سے اُٹھوانے کے لیے میرے پاس کوئی سامان نہیں ہے۔'' خاتون نے جواب دیا اور دونوں کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔

جہاز کی روانگی کا اعلان ہونے پر وہ جہاز پر سوار ہوئے۔ اس مرتبہ ان کی نشستیں ساتھ ساتھ تھیں۔

''میں وقفے وقفے سے خانپور جاتا رہتا ہوں۔ وہاں ہمارے خاندان کی کچھ پراپرٹی ہے جس کا انتظام دیکھنا پڑتا ہے۔ ویسے میری رہائش لاہور میں ہے۔''

''گھر میں اور کون کون ہے؟'' خاتون نے دریافت کیا۔

''میری بیگم ہیں جو کالج میں پڑھاتی ہیں، میرا بیٹا ہے، جو اسی سال کالج میں داخل ہوا ہے اور میری بیٹی ہے جو ابھی سکول میں پڑھتی ہے۔ ہمارا گھر ماڈل ٹاؤن میں ہے۔ اور آپ؟''

''ہم کنٹونمنٹ میں رہتے ہیں۔ میرے والد فوج میں کرنل کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد کچھ عرصہ فوجی فاؤنڈیشن میں ملازمت کی اور راولپنڈی میں پوسٹنگ رہی۔ آج کل گولف کھیلتے ہیں، کتابیں پڑھتے ہیں اور ٹیلی وژن دیکھتے ہیں۔ میرا بڑا بھائی فوج میں کپتان ہے اور چھوٹی بہن انگلش لٹریچر میں ایم اے کر رہی ہے۔ میرے شوہر میرے پھوپھی زاد ہیں اور فوج میں میجر ہیں۔ ان کی پوسٹنگ ملتان میں ہے لیکن اب وہ سٹاف کالج کوئٹہ جا رہے ہیں۔ میں اس لیے تھوڑے دنوں بعد ملتان سے واپس لاہور جا رہی ہوں۔ اگلے ماہ تک شاید میں بھی کوئٹہ چلی جاؤں گی۔''

''بہن تو ابھی پڑھ رہی ہے لیکن بڑے بھائی نے شادی کر لی یا ابھی نہیں''

''وہ ابھی شادی کرنا نہیں چاہتا۔ کہتا ہے میجر بننے کے بعد کروں گا۔ البتہ بہن کے لیے ایک پرپوزل ہے۔''

''صرف پرپوزل ہی ہے ایکسپٹ Accept ہو چکا ہے؟''

''دراصل جو لڑکا اس میں دلچسپی رکھتا ہے وہ حال ہی میں سی ایس ایس میں کامیاب ہو کر ٹریننگ لے رہا ہے۔ آج کل ہی میں اس کے والدین رشتہ مانگنے کے لیے آنے والے ہیں۔''

''لیکن آپ کو پہلے سے کیونکر معلوم ہو گیا۔''

''دراصل میری بہن نے مجھے بتایا تھا۔ اس کی رضامندی سے لڑکا اپنے والدین کو بھیجنے والا ہے۔''

''اچھا۔ اس لڑکے کا نام خالد تو نہیں؟''

''جی ہاں! لیکن آپ کو کیسے معلوم ہوا؟''

''دراصل خالد میرا کزن ہے اور وہ مجھے بتا چکا ہے کہ وہ انگلش لٹریچر والی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔''

''عجیب اتفاق ہے۔''

''بلکہ حسین اتفاق ہے۔ اب میں خالد کے والدین کو سمجھاؤں گا کہ وہ ضرور یہ رشتہ مانگیں اور آپ اپنے والدین کو تجویز ماننے کا مشورہ دیں۔ لڑکے لڑکی کی پسند کا احترام کرنا چاہیے اور اتنی اچھی لڑکی ضرور میرے کزن کے گھر آنی چاہیے۔''

''آپ نے لڑکی کے بارے میں بغیر دیکھے اور بغیر ملاقات کے کیسے رائے قائم کر لی؟''

''آپ کو جو دیکھ لیا اور آپ سے ملاقات بھی ہو گئی۔ آپ اتنی اچھی ہیں تو آپ کی بہن کیا کم ہو گی۔''

دونوں ہنس رہے تھے اور جہاز لاہور ایئر پورٹ پر لینڈ کر رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

کانچ کا رشتہ

سیما پیروز

''بشیرے! روٹی کھالے__'' شیداں نے صحن میں دھریک کے نیچے چارپائی پر لیٹے ہوئے بشیر کو تیسری دفعہ آواز دی۔

''وے بھیڑیا ___ سنتا کیوں نہیں_؟ آج میں نے تیری پسند کا سالن پکایا ہے۔ بینگن کا بھرتہ بنایا ہے۔ ماسی برکتے کے تنور سے روٹیاں بھی لگوا کر لائی ہوں۔ جلدی سے آجا۔ گرم گرم روٹی دیسی گھی سے چپڑی دیتی ہوں۔'' شیداں نے بڑے پیار اور لاڈ سے پکارا۔

بشیر ٹس سے مس نہ ہوا۔ اسی طرح دونوں بازو سر کے نیچے رکھ کے سیدھا لیٹا رہا۔ اللہ جانے کون سی ڈونگھی سوچوں میں کھبا ہوا تھا کہ اس نے نہ تو شیداں کو پرت کے جواب دیا نہ ہی اس کی طرف دیکھا۔

شیداں پریشان سی ہو کے بشیر کی چارپائی کی پائنتی آ کے بیٹھ گئی۔

''بشیرے! کیا ہوا ہے___؟ کسی سے لڑائی ہو گئی۔ یا پھر کوئی اور بات ہے۔؟'' وہ شیداں کے منہ کی طرف بٹ بٹ تکتا رہا۔ منہ سے کچھ نہ بولا۔

''ہائے اللہ_ کیا ہو گیا ہے_؟ بولتا کیوں نہیں۔ آج کیا گونگے کا گڑ کھا لیا ہے۔ چل اُٹھ روٹی کھالے۔ پھر ٹھنڈی ہو جائے گی تو بُڑ بُڑ کرو گا۔'' شیداں نے اپنے پراندے

کے گھنگھرو اس کے چہرے کے آگے چھنکائے۔ پھر بڑے پیار سے بازو پکڑ کے اُسے اُٹھانے کی کوشش کی۔

''نہ کر___ پیچھے ہٹ_ مجھے تنگ نہ کر۔'' بشیر نے بڑی ناگواری سے شیداں سے اپنا بازو چھڑایا۔

شیداں پریشان سی ہو کے چولہے کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ ''یقیناً_ کوئی بڑی بات ہے۔'' کیونکہ بشیر نے نہ تو شیداں کو آتے ہی کلاوے میں بھرا نہ گڈو کو پیار کیا ''ہائے اللہ___ کہیں بڑے دیر کو تو نہیں دیکھ لیا۔'' اس کا دل سہم گیا۔

پڑوسیوں کی بیری پر چڑیاں شور مچا رہی تھیں (جس کی آدھی شاخیں ان کے صحن میں آئی ہوئی تھیں) شیداں کو ان کا شور شرابہ بہت بُرا لگ رہا تھا۔ حالانکہ اسے شام کے وقت بسیرے کے لیے لڑتی شور مچاتی چڑیاں بہت اچھی لگتی تھیں وہ سوچتی چھوٹی چھوٹی جانیں کیسے اپنے گھونسلے کی حفاظت کرتی ہیں اور کتنی سیانی ہیں۔ دھریک چھوڑ کے بیری کے اوپر رات گزارنے کے لیے لڑ لڑ مرتی ہیں۔ شاید اس لیے کہ بلی بیری کے کانٹوں سے ڈرتی درخت کے اوپر نہیں چڑھتی۔ پر آج اُس اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

دور کسی مسجد سے مغرب کی اذان کی آواز آئی تو اس نے بشیر سے کہا۔ ''اٹھ کے بیٹھ جا___ اذان ہو رہی ہے۔ بزرگ کہتے ہیں اس گھڑی دونوں وقت گلے ملتے ہیں۔ لیٹنا اچھا شگون نہیں ہوتا۔''

بشیر اُٹھ کے بیٹھ گیا پر روٹی کھانے چولہے کے پاس نہیں آیا۔

''آج مجھے چھوٹا بھائی ملا تھا۔'' شیداں کا دل دھک سے رہ گیا۔

''بتا رہا تھا کہ بے بے بیمار ہے۔ ہر وقت مجھے یاد کر کے روتی رہتی ہے۔''

شیداں کا رنگ پیلا ہلدی جیسا ہو گیا۔ وہ بولی کچھ نہیں بس چپ کر کے تنکے سے چولہے کی راکھ کریدتی رہی۔

''میں سوچ رہا ہوں کہ میں گھر واپس چلا جاؤں۔ شاید ابا اور بے بے مجھے معاف کر دیں۔''

''میرا کیا بنے گا__؟'' شیداں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''تیرا کیا بنے گا__؟ وہ سوچوں میں گم غیر حاضر سا بولا۔

''میرا مطلب ہے۔ وہ مجھے قبول کر لیں گے۔'' شیداں کی آواز میں خوف تھا۔

''یہ تو اب جا کر ہی پتہ چلے گا۔''

''کیا کہہ رہے ہو_؟ اگر وہ قبول نہ کریں گے۔ تو کیا تم مجھے اور گڈو کو چھوڑ دو گے؟''

''یہ میں نے کب کہا ہے__؟ بشیر کھج کر بولا۔

''تو پھر ہمارے لیے کیا سوچا ہے تم نے__؟

''پہلے میں گھر تو جاؤں۔ پھر ابا اور بے بے کو منا کر تمھیں لے جاؤں گا۔''

''اگر وہ نہ مانے تو___''

''اب تم فضول قسم کے سوال کر کے میرا سر مت کھاؤ۔''

شیداں آنکھوں میں آنسو بھرے کچھ دیر بشیر کو تکتی رہی پھر بولی

''تم تو ایسے خودغرض نہیں تھے۔''

''خودغرضی کی کون سی بات ہے___؟ تم کیا چاہتی ہو کہ میں ساری عمر اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں سے نہ ملوں۔ اُن سے جدا رہوں۔ ویسے بھی میں تیرے مشٹنڈے بھائیوں کے ڈر سے بھاگ بھاگ کر تھک گیا ہوں۔ کتنی دیر مارے مارے پھرتے رہیں گے۔ ہر وقت خوف بھری زندگی میں اب مزید نہیں جی سکتا۔ جب سے تم میری زندگی میں آئی ہو۔ کوئی ایک رات سکون کی نہیں سویا۔ پتہ بھی ہلتا ہے تو خوف سے اُٹھ کر بیٹھ جاتا ہوں کہ ابھی تمھارے بھائی ٹوکے کلہاڑیاں لے کر آئیں گے اور ہمارے ٹوٹے کردیں گے۔''

بشیر دو دن کا کہہ کے گیا تھا۔ آج اسے گئے پورے سات دن ہوگئے تھے۔ نہ اس کی کوئی خیر خبر تھی نہ گھکانے کا پتہ تھا۔ شیداں نے وسوسوں اور خوف کے مارے رو رو کر برا حال کرلیا تھا۔ اس کی بھوک پیاس ختم ہوگئی تھی۔ سو طرح کے برے برے خیال دل میں آتے تھے۔ کبھی وہ سوچتی بشیر امیرے بھائیوں کے ہتھے تو نہیں چڑھ گیا۔ کیا پتہ انھوں نے قتل کر کے کہیں دبا دیا ہو۔ کبھی اسے لگتا وہ اسے چھوڑ گیا ہے۔

ہائے میریا ربّا_ اب میں کیا کروں گی_؟ کہاں جاؤں گی_؟ اگر ماں باپ زندہ ہوتے تو شاید مجھے معاف کردیتے۔ اب تو میرا کوئی سہارا نہیں۔ بڑا ویر تو میرے اتنے ٹکڑے کرے گا کہ شمار بھی نہیں ہوسکیں گے۔ میرے گڈو کا کیا ہوگا_؟ اس کو بھی کہیں میرے ساتھ ہی قتل تو نہیں کر دیں گے_؟''

گڈو کا سوچ کر اس کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی۔ اس نے گڈو کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا جیسے کلیجے میں چھپا لے گی۔

ساری ساری رات اور دن سوچوں میں ڈوبی رہتی۔ گھڑی گھڑی گڈو کو سینے سے لگاتی اس کا منہ چومتی اس کے ہاتھوں کو چومتی آنکھوں سے لگاتی۔

''یا اللہ_ یہ معصوم ہے۔ اس نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ میرے گناہوں کی سزا اسے نہ دینا۔ مولا میرے گڈو کی حفاظت کرنا۔''

''بشیرے تو نے میرے ساتھ اچھی نہیں کی۔ اگر میں جانتی کہ تم قولوں کے اتنے کچے ہو تو تیرا کبھی اعتبار نہ کرتی۔ وہ تیری ساری قسمیں، سارے وعدے، میرے بغیر مر جانے کی دھمکیاں وہ سب ایک فریب تھیں۔ اتنی جلدی تیرے سر سے شادی کا بھوت اُتر گیا۔ تو تو کہتا تھا ہم اکٹھے جئیں گے اکٹھے مریں گے لوگ ہیر رانجھا۔ سوہنی

مہینوال کی طرح ہمارے عشق کی بھی مثالیں دیا کریں گے۔"

"ہائے ظالماں___ تجھے اپنا ہیرے جیسا بیٹا بھی یاد نہیں۔ جس کے بغیر تجھے نیند نہیں آتی تھی۔"

آٹھویں دن دروازے کی کنڈی کھڑکی تو شیداں نے بے تابی کے ساتھ دروازہ کھولا۔ (اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ نام پوچھ کے دروازہ کھولنے کی تاکید تھی) بشیر اور اس کا چھوٹا بھائی تھا۔

شیداں بہت خوش تھی۔ کیونکہ وہ پہلی بار سسرال جا رہی تھی۔ اسے بشیر پر ڈھیر سارا پیار آیا۔ "میں ایسے ہی بدگمان ہو گئی تھی۔ اتنے دن وہ بیچارہ میرے لیے لڑتا رہا ہو گا۔"

سسرال کی دہلیز الانگتے ہی شیداں کا سارا چاؤ ساری خوشی مٹی میں مل گئی۔ اس کے سارے خواب چکنا چور ہو گئے اس کا خیال تھا۔ بہو ہونے کے ناطے اسے سارے مان تان ملیں گے۔ اس کے بیٹے کو دادا دادی گود سے نہیں اتاریں گے۔" شیداں کو سسرال گھر آنے کی اجازت تو مل گئی پر اسے کسی نے بھی دل سے قبول نہ کیا۔ اس کی حیثیت گھر میں نوکرانی سے زیادہ نہیں تھی۔ ساس اور دیورانیاں، جیٹھانیاں اس سے اچھوتوں جیسا سلوک کرتی تھیں۔ صبح سے لے کر رات تک وہ کام کرتی رہتی پھر بھی کوئی اس کے ساتھ سیدھے منہ بات نہیں کرتا تھا۔ وہ کسی کمی کمین کی بیٹی نہیں تھی۔ اس کا باپ اپنے گاؤں میں تگڑا زمیندار تھا۔ وہ سات بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ گھر میں کسی کام کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ اپنے گھر وہ رانیوں کی طرح رہتی تھی۔ یہاں پر وہ بیچاری بھینسوں کا گوبر بھی تھپتی تھی۔ کبھی کبھار اسے اپنے آپ سے نفرت محسوس ہوتی۔ میں کیا تھی اور کیا بن گئی ہوں۔ پچھتاوے کے ناگ اسے ڈنگ مارتے رہتے۔ وہ ساری ساری رات روتے ہوئے گزار دیتی۔ وہ اچھے دنوں کے انتظار میں ساری سختیاں اور ذلت سہہ رہی تھی۔ اسے امید تھی کہ ایک دن بشیر اس کا حق دلا کر رہے گا۔ شیداں کے لیے وقت جیسے رک سا گیا تھا۔ دکھوں کی کالی سیاہ رات اس کے چاروں طرف تنی ہوئی تھی۔ وہ سوچتی جانے سویر کب ہو گی۔ وہ سویر جب وہ بھی عزت سے مان سے اپنے بشیر اور گڈو کے ساتھ اندر حویلی میں سب کے ساتھ رہے گی۔ پھر ہو سکتا ہے کبھی اس کے بھائی بھی اسے معاف کر دیں۔

کچھ دنوں سے وہ محسوس کر رہی تھی۔ جیسے بشیر بدل سا گیا ہے۔ بیگانہ سا ہو گیا ہے۔ سارا دن وہ اسے کہیں نظر نہ آتا۔ وہ اس کا انتظار ہی کرتی رہتی۔ جب آتا تو اسے ہمیشہ جانے کی جلدی ہوتی۔ وہ شکوہ کرتی تو الٹا اسے جھاڑ پلا دیتا۔ "تم کیا چاہتی ہو ہر وقت تمہارے گھٹنے سے لگا بیٹھا رہوں۔ چار سال

تمھارے ساتھ ہی رہا ہوں نا۔ اب میں اپنے گھر والوں کے پاس نہ بیٹھوں۔''
اگر وہ کبھی گھر والوں کے سلوک کا گلہ کرتی تو ترنت جواب دیتا۔ ''اب جو کچھ بھی ہے صبر کے ساتھ برداشت کرو۔ شکر کرو انھوں نے تمھیں گھر میں رکھ لیا ہے۔''
''برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ میں کتنا صبر کروں۔'' میں نے تو اپنی ساری ہستی ہی مٹا دی ہے۔ کچھ تمھارے پیچھے اور کچھ تمھارے گھر والوں کے دلوں میں گھر کرنے کے لیے۔ پر ابھی تک تو کسی کا منہ سیدھا نہیں ہوا۔ میرے ساتھ اچھوتوں جیسا سلوک ہوتا ہے۔ تیرے گھر والے میرے پرچھانویں سے بھی بھاگتے ہیں۔ بچوں کو بھی میرے ساتھ بات چیت کرنے سے منع کرتے ہیں۔ میرا قصور کیا ہے_؟ مجھے اتنا تو بتا دو۔'' اس کی آنکھوں سے موتیوں کی طرح آنسو گر رہے تھے۔
''یہ تم بھی جانتی ہو۔'' بشیر بے نیازی سے بولا۔
''یہ تم کہہ رہے ہو۔؟'' حیرت اور دکھ سے شیداں کے آنسو خشک ہو گئے۔ بشیر کھڑا کھڑا شیداں کے کمرے میں آتا۔ گڈو کو اوپرا سا پیار کرتا اور پھر چوروں کی طرح نکل جاتا۔ شیداں سب کچھ کھلی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ پھر بیچاری کیا کر سکتی تھی؟ سوائے صبر کے۔
ایک روز اس نے بشیر سے گلہ کیا۔
''بشیرے! تم اب بدلے بدلے سے لگتے ہو۔ جیسے تمھیں میرے ساتھ کوئی محبت نہیں رہی۔''
''نہ اب تم کیا چاہتی ہو؟ آٹھوں پہر رانجھا بنا پھروں۔ زندگی میں اور بھی بڑے کام ہیں۔ تم ہر وقت گلے ہی کرتی رہتی ہو۔ جب آگے سے رونی بوتھی دیکھنے کو ملتی ہے۔'' وہ غصے سے اُٹھ کر چلا گیا۔
شیداں بہت پریشان اور ڈری ہوئی تھی۔ اسے لگتا تھا جیسے اندر ہی اندر کوئی کھچڑی پک رہی تھی۔ اخیر اسے بھی ایک دن پتہ چل ہی گیا۔
ماسی جیناں کو شیداں پہ بہت ترس آتا تھا۔ دوسری بہوئیں تو راج کر رہی تھیں یہ بیچاری گدھوں کی طرح سارا دن کام کرتی تھی پھر بھی اس کے ساتھ کوئی سیدھے منہ بات نہیں کرتا تھا۔ الٹا ہر وقت طعنے دیئے جاتے۔ اسے ذلیل کیا جاتا۔ جس دن وہ بشیر کے ساتھ حویلی میں آئی تھی۔ اس کا حسن ڈھلکاں مار رہا تھا۔ چہرے سے نظر نہیں ہٹتی تھی۔ ماسی نے سوچا تھا کہ بشیرا اگر اس کے پیچھے پاگل ہوا تھا تو وہ سچا تھا۔ پر اب تو بیچاری رُل گئی تھی۔ چاندی جیسا رنگ جلے ہوئے تانبے جیسے ہو گیا تھا۔
''شیداں دھیئے! میں نے تمھیں ایک بات بتانی ہے۔ پر وعدہ کرو_ میرا نام نہ آئے۔ ورنہ چوہدری اللہ داد میری کھال کھنچوا دے گا۔''
''ماسی! میں وعدہ کرتی ہوں۔''
''بشیر! دوسری شادی کر رہا ہے۔''
''سچ ماسی! کہہ دو کہ یہ جھوٹ ہے۔ میرا بشیرا

مجھے کبھی دھوکا نہیں دے سکتا۔"

"شیداں نے بے تابی سے ماسی کی بات کاٹ دی۔

"نہیں دھیئے یہ سچ ہے۔"

شیداں کا دل جیسے کسی نے تیز دھار آلے سے دو ٹکڑے کر دیا۔ کتنی دیر مارے صدمے کے اسے چپ سی لگ گئی۔

"ماسی! شادی کہاں کر رہا ہے_؟ اس کی آواز جیسے گہرے کنوئیں سے آئی۔

"اپنے بچپن کی منگ کے ساتھ، جو اس کے ماموں کی بیٹی ہے اور اسی کے بھائی سے بشیرے کی بہن بیاہی ہوئی ہے۔"

قبر سے نکلے مردے نے پوچھا۔ "شادی کب ہے۔"

میرا خیال ہے چڑھے چاند کی دس تاریخ کو بارات جانی ہے۔"

ماسی تو چلی گئی پر شیداں کو جیسے کانٹوں کی باڑھ پر پھینک گئی۔

اس کے چاروں طرف جیسے آگ کے بھانبڑ مچ رہے تھے۔ جس میں اس کا سب کچھ جل کے خاک ہو گیا تھا۔ اس کی محبت کا مان اس کا اعتبار اس کے ارمان۔ سب کچھ راکھ ہو گیا تھا۔ ساری رات اس نے سوچتے اور جاگتے گزار دی۔ ایک پل بھی اس نے آنکھ نہ جھپکی۔ کبھی وہ سوچتی کہ ٹوکہ لے کر بشیرے کے ڈکرے کر دے کبھی اس کی منگیتر کو تیل ڈال کر جلانے کے منصوبے بناتی رہی بڑی مشکل سے بشیر اس کے ہاتھ لگا۔ اس کا گریبان پکڑ کے وہ اونچی اونچی رونے لگی۔

"پرے ہٹ! کیا ہوا ہے؟ پاگل ہو گئی ہے۔ بشیر گھبرا گیا۔

"ہاں! میں پاگل ہو گئی ہوں۔ میرے دل میں آگ لگی ہوئی ہے۔"

"پھر کوئی بات بھی ہو۔"

"اتنا بھولا اور انجان نہ بن۔" شیداں چیخ کر بولی۔

"کیا بکواس ہے۔ سیدھی طرح بات کرو بجھارتیں نہ بجھواؤ۔" وہ غصے سے بولا۔

"تم دوسری شادی نہیں کر رہے_"

ایک لمحے کے لیے بشیر چپ کا چپ رہ گیا۔

"تمھیں کس نے بتایا_؟

"جس نے بھی بتایا ہو، میں بھی یہیں رہتی ہوں۔ بے شک حویلی میں نہیں رہتی۔ لیکن آنکھیں اور کان تو رکھتی ہوں۔"

بشیر چپ رہا۔

"تم مجھے ہاں یا نہ میں جواب دو۔ میں تمھاری منہ سے سننا چاہتی ہوں۔ تم شادی کر رہے ہو یا نہیں___؟

"ہاں! کر رہا ہوں۔" بشیر نے کمال ڈھٹائی سے مان لیا۔

"تمھیں شرم نہیں آتی دوسری شادی کرتے ہوئے۔" شیداں بپھری شیرنی بن گئی۔

"کیوں؟ شرم کی کون سی بات ہے۔ وہ میری بچپن کی منگ ہے۔"

"اس وقت منگ کدھر تھی_؟ جب مجھ سے

شادی کی تھی۔'

''بکواس نہیں کرو۔''

''میں اپنے ماں باپ کو اور ناراض نہیں کر سکتا۔ میں نے پہلے ہی ان کا بڑا دل دکھایا ہے۔''

'اب تمھیں ان کی ناراضگی کا بہت خیال ہے۔'' شیداں نے طنز کیا۔

''اگر تمھیں اپنے گھر والوں کا کوئی خیال نہیں تو کیا میں تمھارے جیسا بے شرم بن جاؤں۔'' بشیر نے اسے طعنہ دیا۔

''ڈوب مرو__ مجھے طعنے معنے دینے سے پہلے۔''

''کیوں _؟ میں کیوں ڈوب مروں۔ تمھیں یہ کام بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا۔''

'شیداں کا کلیجہ کٹ کے رہ گیا۔ وہ کتنی دیر کچھ نہ بول سکی۔

پھر اس نے ڈھیٹ بن کے پوچھا۔ ''میرا کیا بنے گا_؟ اس کے پاس کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔

''ادھر ہی رہو گی۔ میں کون سا تمھیں گھر سے نکال رہا ہوں۔''

''تیرا کیا اعتبار_ گھر والوں کے کہنے سے اگر دوسری شادی کر سکتے ہو۔ تو ان کے کہنے پر گھر سے بھی نکال سکتے ہو۔''

''ابھی تک تو کوئی ارادہ نہیں تھا پر اگر تم اسی طرح بکواس کرتی رہو گی تو شاید یہ موقع بھی آ جائے۔''

شیداں کو جیسے کسی نے ماچس کی تیلی دکھا دی۔

''بے شرم! اتنی جلدی اپنے قول قرار بھول گئے ہو۔ تم تو کہتے تھے چاہے دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے تم مجھے کبھی دھوکہ نہیں دو گے۔ بے ایمان۔ یہ تھا تیرا پیار__ اور یہ تھے تیرے مرنے جینے کے وعدے۔ یاد کرو۔ کس طرح میری ایک جھلک دیکھنے کے لیے پوہ، ماگھ کی سردی میں ساری رات میری کھڑکی کے نیچے کھڑے رہتے تھے۔''

''اچھا زیادہ بک بک نہ کر۔'' وہ کھسیا کر بولا۔

''اب میری باتیں تمھیں بک بک لگتی ہیں۔ کبھی میری آواز کو کوئل کی آواز سے ملاتے تھے۔ کہتے تھے ''شیداں تیری آواز سن کے میں مرا ہوا بھی جی اُٹھوں گا۔ یاد رکھ میں تجھے یہ ظلم نہیں کرنے دوں گی۔ تو مجھے اور میرے بچے کو اس طرح بیچ منجدھار نہیں چھوڑ سکتے۔''

''کیا کر لو گی؟ تم میرا__ جا جو تیرے دل میں آئے کر۔ دفعہ دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔ پیچھا چھوڑ و میرا__''

شیداں نے رونا شروع کر دیا۔ 'میں تمھیں دوسری شادی نہیں کرنے دوں گی۔''

''تم مجھے روکنے والی کون ہوتی ہو۔''

''میں تمھاری بیوی ہوں۔ میری اجازت کے بغیر تم دوسری شادی نہیں کر سکتے۔ میں چیئرمین کے پاس شکایت کروں گی۔''

''جاؤ ضرور شکایت کرو۔ وہ طنزیہ ہنسا پہلے اپنا نکاح تو ثابت کرو۔ کیا بتاؤ گی چیئرمین کو۔ کہ ''ماں باپ کی عزت پیروں تلے

روند کر میں بھاگ آئی تھی۔'' وہ تو شکر کرو میں شریف تھا۔ تیرے ساتھ چار دوستوں کی موجودگی میں نکاح پڑھوا لیا۔ ورنہ گھروں سے بھاگی ہوئی لڑکیوں کے ساتھ شادی کون کرتا ہے۔ لوگ چار دن عیش کرتے ہیں اور پھر ردی کاغذ کی طرح کوڑے پر پھینک دیتے ہیں۔'' شیداں لق دق اس کا منہ دیکھ رہی تھی۔

''اگر میں نکاح سے مکر جاؤں تو تیرے پاس کیا ثبوت ہے کہ ہماری شادی ہوئی تھی۔ کیا میں تجھے بیاہنے بارات لے کر تیرے گھر گیا تھا اور تیرے ماں باپ، بہن بھائیوں نے ڈولی میں بٹھا کر تجھے وداع کیا تھا۔ بشیر نے پل میں شیداں کو آسماں سے زمین پہ گرا دیا۔ وہ حیران کھڑی یہ سوچتی رہ گئی۔ ''کیا یہ وہی بشیر ہے جو اس کی خاطر جان دینے پہ تیار تھا۔ جو اسے دیکھے بغیر سو نہیں سکتا تھا۔''

ساری رات وہ اپنے ماں باپ کو یاد کر کے روتی کرلاتی رہی اور اُن سے معافیاں مانگتی رہی۔ وہ شرماں والے تو اس کے گھر چھوڑنے کے دو سال کے اندر ہی اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ ''ہائے ربا جس کی خاطر گھر بار چھوڑا۔ ماں باپ کا دل دکھایا ان کی عزت کو بٹہ لگایا۔ بھائیوں کے سر میں خاک ڈالی۔ آج وہی مجھے اُدھل گئی (گھر سے بھاگی) کے طعنے دے رہا ہے۔'' رو رو کر شیداں کے آنسو بھی خشک ہو گئے تھے۔ جس دن بشیر کی بارات جانی تھی شیداں سارا دن اپنی کوٹھڑی میں ہی رہی۔ بھوکی پیاسی۔ کسی نے اس کو نہ بلایا۔ گڈو نے کئی بار روٹی مانگی پر شیداں چپ چاپ پتھر بنی لیٹی رہی۔

ماسی جیناں ڈوبتی شام کو اس کی کوٹھڑی میں آئی اور اس کے ہاتھ میں میٹھے چاولوں کی پوٹلی سی پکڑا گئی۔

''لے شیداں! کھا لے جھلی۔ تیرے بھوکے رہنے سے کیا تیری تقدیر بدل جائے گی۔''

''ماسی! مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔''

''اچھا___ گڈو کو تو کھلا۔ بیچارہ صبح سے بھوکا ہے۔''

''ماسی دلہن آ گئی ہے۔''

''ہاں! پچھی (عصر) کے وقت آ گئے تھے۔ میں نے کئی بار تیرے پاس آنا چاہا پر کام سے ہی فرصت نہیں ملی۔''

''ماسی! میرا ایک ایک کام کرے گی۔''

''ضرور بتاؤ مجھے۔''

''جاؤ دیکھ کر آؤ دلہن کے کمرے میں زیادہ لوگ تو نہیں بیٹھے ہوئے۔''

''ماسی تھوڑی دیر بعد تیز تیز آئی۔ ''اس وقت دلہن کو اکیلا ہی سمجھو۔ دو چار لڑکیاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ پر تم نے دلہن کو کیا کہنا ہے۔ دیکھو کوئی الٹی سیدھی حرکت نہ کرنا۔ بڑے کمرے میں ہے دلہن۔''

''کچھ نہیں ماسی۔ میں نے اسے ایک امانت دینی ہے۔ تم دو منٹ گڈو کے پاس بیٹھو۔ میں گئی اور آئی۔'' شیداں تیزی سے باہر

نکل گئی۔
دلہن کے کمرے میں بیٹھی رشتہ دار لڑکیاں شیداں کو دیکھ کر حیران سی ہو گئیں۔
شیداں نے دلہن کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیے اور بولی۔ پریشان مت ہو۔ میں شیداں ہوں۔ یہ لو انگوٹھی۔ یہ بشیرے نے مجھے منہ دکھائی میں دی تھی۔ اللہ تمھیں مبارک کرے۔''
انگوٹھی دلہن کے ہاتھ پہ رکھ کے تیزی سے کمرے سے نکل آئی۔
مسجد سے مغرب کی اذان کی آواز آئی۔ تو اس نے وضو کیا اور نماز پڑھی اور دیر تک روتی رہی اور اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتی رہی۔ پھر اس نے سوئے ہوئے گڈو کو اپنی گود میں اُٹھا لیا وہ اس کا منہ سر چومتی جاتی تھی اور کہتی تھی میرے بچے اپنی گنہگار ماں کو معاف کر دینا۔''
بشیر، اس کے گھر والے اور کچھ مہمان صحن میں بچھی چارپائیوں پر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ بشیر کا قہقہہ سب سے بلند تھا۔
شیداں کو دیکھ کے جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا۔
''بشیرے! تو نے یہی کہا تھا نا کہ بیوی صرف وہی ہوتی ہے جسے سماج کے سامنے باجوں گاجوں اور سہروں کے ساتھ بیاہ کے لاؤ۔ جو عشق کے پیچھے ماں باپ کی عزت پیروں تلے روند کر گھر کی دہلیز الانگ آتی ہیں۔ وہ رکھیل تو بن سکتی ہیں کسی گھر کی عزت نہیں بن سکتی۔ تو نے اچھا کیا مجھے آئینہ دکھا دیا۔''
بشیر پھٹی آنکھوں اور کھلے منہ کے ساتھ شیداں کو دیکھ رہا تھا۔
وہ تھوڑی دیر خاموشی سے بشیر کو دیکھتی رہی پھر بولی۔ ''تجھ سے میں نے آخری بات پوچھنی ہے گڈو کی قسم کھا کر بتا۔ میں تمھاری بیوی تھی یا رکھیل تھی۔ کیا وہ مولوی اور گواہ بھی جھوٹے تھے۔ سچ بتاؤ مجھے۔'' شیداں جیسے دیوانی سی ہو گئی تھی۔
''میں نے تم سے شادی کی تھی۔'' بشیر مری ہوئی آواز میں بولا۔
اگر بیوی تھی تو تمھارے گھر میں مجھے اس طرح ذلیل کیوں کیا گیا نوکرانیوں سے بھی بدتر سلوک کیا گیا۔ میں اور میرا بچہ اچھوت بن کے رہ رہے ہیں تمھارے گھر میں۔''
آنسو شیداں کے گالوں کو بھگو رہے تھے۔
مجھے تم سے اور تمھارے گھر والوں سے کوئی گلہ نہیں مجھے سماج اور معاشرے سے گلہ ہے۔ اگر گھر سے بھاگنا جرم تھا، تو ہم دونوں ہی سزاوار تھے پھر سزا صرف مجھے کیوں مل رہی ہے؟۔ یہ بہت بڑی ناانصافی ہے۔ میں اپنا فیصلہ اللہ پر چھوڑتی ہوں۔ سزا اور جزا کا مالک وہی ہے۔''
پھر اس نے پورے زور سے گڈو کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا اور پیشتر اس کے کوئی کچھ سمجھ پاتا شیداں نے کنوئیں میں چھلانگ لگا دی۔

☆☆☆☆☆

غمِ ہستی

نیلم احمد بشیر

چونکہ ہم دونوں اکٹھی اندر لائی گئیں تھیں اس لئے مجھے اس سے خواہ مخواہ ہی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ دونوں ایمبولینس گاڑیاں رکیں تو ہسپتال کے وارڈ بوائے جلدی جلدی آگے بڑھے، ہم دونوں کے سٹریچروں کو اٹھایا اور جلدی جلدی ہمیں آئی سی یو کی طرف لے کر بھاگے۔

مجھے میرے اُسی پرانے دمے کے اٹیک نے وہاں لا پٹخا تھا جس نے میری زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ اس کی وجہ سے میں اکثر تکلیف میں رہا کرتی تھی۔ مہینہ دو مہینہ بعد ایک زبردست قسم کا اٹیک اس شدت کا آجاتا کہ میرے گھر والوں کو مجھے ہسپتال لے جانا پڑ جاتا۔ وہاں مجھے کچھ روز رکھتے، دوائیاں ، ٹیکے گلوکوز، آکسیجن، غرضیکہ میرے مرض کے مداوے کے طور پر نہ جانے کیا کچھ کیا جاتا تب کہیں جا کر میری حالت سنبھلتی۔ میرا سسٹم دوبارہ نارمل ہو جاتا تو میں گھر روانہ ہو جاتی۔ بس یہی تھی میرے اس مرض کی نوعیت اور صورت حال جس نے اس روز بھی جب اپنی پوری طاقت سے مجھ پر حملہ کیا تو مجھے تقریباً ڈھیر ہی کر کے رکھ دیا۔

سانس تھا کہ جیسے سینے میں کسی نے ماچس کی تیلی سلگا کر چھوڑ دی ہو۔ تیز جلن اور سارے جسم میں کھنچاؤ، سر کا چکرانا اور اعصاب کا تناؤ، غرضیکہ حالت کافی خراب تھی۔ گھر میں میری بیٹی زیبی نے جو اتفاق سے اس وقت میرے پاس موجود تھی مجھے ایک ٹرینکولائزر دے دیا تھا تاکہ میں ذرا پرسکون ہو جاؤں۔ اسی وجہ سے ہسپتال پہنچنے تک میں نیم غنودگی، نیم بے ہوشی کی سی کیفیت میں مبتلا تھی۔ ادھ کھلی آنکھوں سے ہی میں نے دیکھا کہ مجھے اور اُسے، دونوں کو سٹریچرز پر ڈال کر جلدی جلدی آئی سی یو کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔

آئی سی یو روم میں یوں بڑا سا ہال نما کمرہ تھا مگر اس میں باریک پردے ڈال کر مریضوں کے لئے علیحدہ علیحدہ حصے بنا دیئے گئے تھے۔ اتفاق سے وہ میرے ساتھ والے سیکشن کے بیڈ پر ہی لٹائی گئی تھی یعنی ہم دونوں اب ہمسایہ بھی تھیں۔

میں سونے جاگنے، پلکیں جھپکنے کے بیچ اتنا اندازہ تو لگا چکی تھی کہ وہ گورے چٹے رنگ کی چالیس بیالیس سالہ مضبوط جسم کی مالک عورت تھی مگر اسے تکلیف کیا تھی؟ اتنا جاننے کی میں ابھی خواہش نہیں جاگی تھی کیونکہ اس وقت میں خود بے حد جسمانی تکلیف میں مبتلا تھی۔

وہ بالکل ساکت، بے جان سی وہاں لیٹی ہوئی تھی۔ زندگی کی کوئی رمق اس میں دکھائی نہیں دیتی تھی۔ رات ہونے کو تھی۔ ڈاکٹروں نے دوائیوں کا ایک انبار میرے لئے تجویز کیا تھا جن میں سے کچھ مجھے اُسی وقت دے دی گئیں۔ اب میرا سانس کچھ قابو میں آنے لگا تھا۔ میں سونے کی کوشش کرنے لگی مگر میری ناک پر لگے ہوئے آکسیجن ماسک کی وجہ سے بے چینی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ بالآخر میں کچھ دیر کو اونگھنے میں کامیاب ہو ہی گئی اور رات اسی طرح گذر گئی۔

صبح آنکھ کھلی تو دیکھ میری بیٹی زیبی میرے سرہانے موجود تھی۔ وہ اپنے بچوں کو سکول چھوڑنے کے بعد گھر جانے کی بجائے سیدھا میرے ہی پاس آ گئی تھی۔ ڈاکٹر نے مجھے بات چیت کرنے سے منع کر رکھا تھا اس لئے ہم دونوں ماں بیٹی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں کیں بلکہ میں اگر یہ کہوں کہ زیادہ تر زیبی ہی باتیں کرتی رہی تو بالکل سچ ہوگا۔

زیبی حسبِ معمول خوشگوار موڈ میں تھی۔ اس کی ہمیشہ سے ہی یہ عادت رہی ہے کہ مشکل سے مشکل وقت میں بھی وہ ہنسنا مسکرانا نہیں چھوڑتی بلکہ ایسے ایسے چٹکلے چھوڑتی ہے کہ دوسرا مکمل سنجیدگی کے باوجود ایک بار تو ضرور کھلکھلا کر ہنس پڑتا ہے۔ بڑی پیاری عادت ہے میری بیٹی کی، جیسی وہ خود ہے۔

ساتھ والی مریضہ کے سیکشن سے ایک پریشان صورت خاتون باہر نکل رہی تھی۔
''کیا ہوا ہے انہیں؟'' زیبی نے اخلاقاً پوچھا
''ہارٹ اٹیک ہوا تھا چار روز پہلے۔ میری بڑی باجی ہیں یہ۔ کچھ عرصے سے انہیں کچھ اٹیک سے ہونے لگے تھے۔ کبھی کبھی تو بالکل سُدھ بُدھ کھو دیتی ہیں۔ اب تین روز سے کومے میں چلی گئی ہیں۔ پتہ نہیں کیا ہوا ہے؟ ڈاکٹرز بھی ٹیسٹ پر ٹیسٹ کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ابھی ان کی حالت خطرے سے باہر نہیں ہوئی۔''
اُس کے چہرے پر دکھ کی پرچھائیاں رینگنے لگیں۔ اب وہ زیبی سے میرا حال پوچھنے لگی اور زیبی میری داستانِ غم اسے سنانے لگی۔
ڈیوٹی نرس نے میری ڈرپ میں سے ٹپکتے قطروں کی رفتار کو تھوڑا اور تیز کر کے خاتون سے اس کی بہن کے بارے میں بات چیت شروع کر دی۔
''ان کے ہزبینڈ بچے وغیرہ؟'' نرس نے سوال کیا
''باجی پروفیسر ہیں، کالج میں پڑھاتی ہیں۔ بس پڑھانے کا اتنا جنون تھا کہ شادی کرنے کا یہی سمجھیں کہ وقت ہی نہیں ملا۔ پھر وقت نکل گیا۔ اب یہ میرے ساتھ ہی رہتی ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔
مجھے کمزوری محسوس ہو رہی تھی اس لئے میں نے تھک کر آنکھیں موند لیں اور گزری ہوئی رات کے بارے میں سوچنے لگی۔ کتنی بھیانک رات تھی وہ۔ میرا سانس کیسے اکھڑ اکھڑ جاتا تھا۔ آئی سی یو کے مختلف انکلوژرز میں لیٹے ہوئے مختلف امراض میں گرفتار اور ان کی آہیں کراہیں اور درد میں لپٹی ہوئی ہسپتال کی بوجھل فضا۔ ہسپتال کا ماحول مجھے کبھی اچھا نہیں لگتا مگر افسوس کہ ایسا روگ جان کو آ لگا ہے کہ ہر مہینہ دو مہینہ بعد مجھے وہاں پہنچا کر ہی چھوڑتا ہے۔
''گڈ مارننگ... کیسی ہیں آپ؟'' مارننگ راؤنڈ پر آئے ہوئے ڈاکٹر کی، زندگی سے بھرپور آواز سن کر میں نے ہولے سے آنکھیں کھول دیں۔ ڈاکٹر کے ساتھ ایک نرس اور غالباً ایک لیب ٹیکنیشن تھا کیونکہ اس کے ہاتھ میں بلڈ ٹیسٹ کرنے کا پورا ساز و سامان موجود تھا۔ اس کا سفید کوٹ ڈاکٹر کے سفید کوٹ کی نسبت قدرے ملگجا سا تھا۔
''اوہ نو... بلڈ ٹیسٹ؟'' میں نے برا سا منہ بنا کر سوچا اور اپنا بازو چیکے سے آگے بڑھا دیا۔ اس کے علاوہ اور چارہ بھی کیا تھا۔
میرے بعد وہ لوگ میری ساتھ والی پروفیسر کے بیڈ کی طرف چلے گئے اور غالباً اس کا حال چال معلوم کرنے یا بلڈ ٹیسٹ لینے میں مصروف ہو گئے۔ پتہ نہیں کیونکہ میں پھر غنودگی کے سمندر میں غوطے کھانے لگ گئی

تھی۔ چونکہ آئی سی یو میں لواحقین کو زیادہ دیر ٹھہرنے کی اجازت نہیں تھی اس لئے زیبی کچھ دیر ٹھہر کر پھر آنے کا کہہ کر چلی گئی۔

دن جیسے تیسے گذر ہی گیا۔ سارا دن آکسیجن ماسک کے سہارے سانس لیتے لیتے طبیعت بیزار ہوگئی مگر میں حوصلہ کر کے اسے برداشت کرتی رہی۔ دن میں میرے گھر والے ایک دوبار آئے، مجھے دیکھ کر تسلی دے کر پھر چلے گئے۔

ظالم رات پھر آ گئی اور وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ سانس پھر بے قاعدہ ہوگیا۔ سینے میں دھونکنی سی چلنے لگی اور درد کے مارے پسلیاں چٹخنے لگیں۔ یوں لگتا تھا جیسے ایک سیلاب میرے سینے میں رکا ہوا اور اچھل اچھل کر میرے سینے کی دیواریں توڑ دینے کے درپے ہے۔ ڈاکٹروں نے پھر ڈھیر ساری دوائیاں مجھے دیں جن کی وجہ سے حالت کچھ کنٹرول ہوگئی مگر نیند پھر بھی نہیں آ رہی تھی۔ سکون بخش گولیاں پھانکنے کے بعد کچھ غنودگی سی طاری ہونا شروع ہوگئی میرا ذہن پرانا پاپی ہے۔ مکمل سپردگی اس کا وصف نہیں، اس لئے بیچ بیچ میں سے جاگ رہا تھا۔ ادھ سوتے ادھ جاگتے کی سی کیفیت کے بیچ بھٹکتا رہا تھا۔ آنکھیں موند کر میں نے اپنا دھیان زیبی اور اس کے بچوں کی طرف لگا دیا۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا جب میری آنکھ خود بخود کھل گئی۔ میری نیم خواب آنکھوں نے دیوار پر لگی گھڑی سے ٹائم دیکھنے کی کوشش کی مگر کمرے میں اندھیرا ہونے کی وجہ سے مجھے کچھ نظر نہیں آیا۔ اچانک میری نظر آئی سی یو ہال میں چلتے سفید کوٹ میں ملبوس ایک ہیولے پر جا پڑی۔ وہ میری ہی طرف آ رہا تھا۔ ذرا سا قریب آیا تو میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی صبح والا لیب ٹیکنیشن تھا جس نے میرا بلڈ ٹیسٹ کیا تھا۔

غالباً سب مریض سوئے ہوئے تھے کیونکہ کمرے میں کسی قسم کی کوئی آواز یا آہٹ سنائی نہیں دیتی تھی۔

''اوہ نو... یہ بلڈ ٹیسٹ کا کون سا وقت ہے؟'' میں نے ناگواری سے سوچا۔ اُسی لمحے میں نے اس کے موٹے سی سرنج کی سوئی کو اپنے بازو میں چبھتا ہوا محسوس کیا اور اس کے انتظار میں آنکھیں موند لیں۔ کچھ دیر انتظار کے بعد میں نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ آیا کیوں نہیں؟

''اوہ... تو یہ اُس بے چاری کی شامت آنے والی ہے۔'' ہیولے کو کومے میں پڑی بے خبر پروفیسر کے سرہانے کھڑا دیکھا، پل بھر کو میرے دل کو تسلی سی ہوگئی کہ چلو میں تو بلڈ ٹیسٹ سے بچ گئی۔ مگر اس کا بھی، اس وقت؟ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ میرا دل بیٹھ گیا

اور مجھے افسوس ہونے لگا۔

وہ اس کے قریب کھڑا ہو گیا۔ پھر کھڑے کھڑے اس کے بے انتہا قریب ہو گیا۔ اتنا قریب کہ اب وہ مجھے علیحدہ سے نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ میری نیم خواب آنکھوں میں ایک لمحے کو جیسے آگ سی بھر گئی۔ ''یا اللہ! یہ کیا؟ میں نے دوبارہ غور سے دیکھنے کے لئے اپنی تھکی تھکی پھٹی ہوئی آنکھیں پوری طاقت سے کھول دیں۔

ٹاور آف سائیلنس پر رکھی ہوئی لاش کو ایک بڑا سا بھوکا گِدھ ٹھونگے مار مار کر نوچنے لگا۔ میرے سارے جسم میں باریک باریک سوئیاں چبھنے لگیں اور سانس پھر سے اکھڑ گیا۔

''اوہ خدایا! ایک مجبور بے بس عورت کے ساتھ اتنا ظلم؟ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ کہیں میں کوئی بھیانک خواب تو نہیں دیکھ رہی؟ میں نے چیخنا چاہا مگر شاید میرے خستہ، ٹوٹے ہوئے سینے میں اس وقت ایسی کوئی چیخ موجود نہ تھی جو اس ظلم کے احتجاج کی سکت رکھتی۔

''ہائے اللہ اتنی بیمار ہے یہ تو...!'' میرا دماغ پھٹنے لگا اور بہت ساری چیخیں میری آنکھوں سے آنسو بن کر بہہ نکلیں۔

''جی؟'' نرس نے آ کر میرے کان میں پیار سے سرگوشی کی۔ آکسیجن ماسک لگے ہونے کے باوجود میرا سانس بالکل بند ہو چلا تھا۔ مجھ سے کچھ بولا ہی نہ گیا۔ ہاتھ کے اشارے سے کچھ کہنے کی کوشش کی تو اس نے بڑے تحمل سے، پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ مجھے میری دوائی کی اگلی ڈوز دی اور تھپک کر جاتے ہوئے بولی۔ ''اب آپ آرام سے سو جایئے۔''

خوف اور غصے کے مارے میں تمام رات انگاروں پر لوٹتی رہی۔ رہ رہ کر مجھے اس بے چاری کا خیال آتا رہا جس کو کچھ خبر نہیں تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہو چکا ہے۔ کہیں وہ اس زبردستی کی وجہ سے مر ہی نہ گئی ہو؟

مجھے ڈراؤنے سے خیال آنے لگے۔ کیا اتنی سیریس کنڈیشن میں تھی وہ؟ مگر میں چپ نہیں رہوں گی۔ اس کی موت کا راز کھول کر چھوڑوں گی۔ غضب خدا کا، دل کی مریض، پھر خطرے کی حالت میں... اتنی اندھیر نگری؟ اتنی حیوانیت؟ میں بے بسی سے کروٹیں بدلتی رہی۔ نیند کے سمندر میں ڈوبتے ابھرتے رات بیت ہی گئی۔

زیبی کو دیکھتے ہی مجھے احساس ہوا کہ صبح ہو چکی تھی۔ اس کا چہرہ سورج کی اولین تازہ کرنوں میں دھلا اور اجلا سا محسوس ہو رہا تھا۔

''پیاری امی کیسی ہیں آپ؟'' اس نے اپنے چہرے جیسا شگفتہ اور رنگ دار نئے نئے پھولوں کا گلدستہ میرے سرہانے سجاتے ہوئے میرا حال چال پوچھنا شروع کر دیا۔

ساتھ والی کی بہن بھی اُسی لمحے اندر داخل ہوئی اور سر کے اشارے سے ہمیں سلام کر کے اپنی باجی کی جانب بڑھنے لگی۔

میرے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ بے چاری عنقریب اپنی بہن کو مردہ پا کر چیخنے چلانے لگے گی۔ مارننگ ڈیوٹی کی نرس بھی تھرمامیٹر، چارٹ وغیرہ ہاتھ میں تھامے میرے سرہانے آن کھڑی ہوئی۔ کرب کی ایک لہر میں نے اپنے سینے میں اٹھتی محسوس کی۔

میں اُسے جلد سے جلد رات والے حادثے کی بابت بتا دینا چاہتی تھی۔ میں اسے ایک بھیڑیئے کی، اس ہسپتال کے ماحول میں موجودگی کی فوراً اطلاع دینا چاہتی تھی۔ ابھی نرس نے تھرمامیٹر میرا ٹمپریچر لینے کے لئے جھٹکا ہی تھا کہ پروفیسر کی بہن کی ایک چیخ نما آواز سنائی دی۔

''نرس جلدی آؤ۔ ڈاکٹر صاحب کو بلاؤ۔''

نرس فوراً اس کی طرف لپکی۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ ''یا اللہ خیر! انا للہِ وانا الیہِ راجعون میں نے دل ہی دل میں پڑھا اور پھر اگلے ہی لمحے میرے لبوں سے دھیرے دھیرے گالیاں نکلنے لگیں۔ قاتل... کمینہ... خنزیر...''

میرے منہ میں جو آیا میں بکتی چلی گئی۔ زیبی نے بھی ایک لمحے کو اس ساتھ والی کے سیکشن کی طرف دیکھا اور پھر میرے لئے تھرماس سے گرما گرم چائے انڈیلنے لگی۔ میری زبان لکڑی کی مانند سخت ہو رہی تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اس جانب نظر دوڑائی۔

نرس اور پروفیسر کی بہن، اس پر جھکی ہوئی نہ جانے کیا کر رہی تھیں۔ دونوں کی ہلکی ہلکی آوازیں بھی آ رہی تھیں مگر کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں نرس ہمارے سیکشن کا پردہ اٹھا کر اندر آ گئی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا اور کچھ کہنے کے لئے لب کھولے۔

''نرس! وہ ساتھ والی...؟'' میری خشک زبان سے بڑی مشکل سے یہ جملہ نکلا۔

''جی! وہ پروفیسر صاحبہ...؟ کوئی معجزہ ہی ہو گیا ہے۔ وہ ہوش میں آ گئی ہیں۔ کتنی خوشی کی بات ہے نا؟ ان کی بہن تو خوشی سے پاگل ہوئی جا رہی ہیں۔ بس مسز بٹ اب آپ بھی جلدی سے ٹھیک ہو جائیں تاکہ آپ کی بیٹی بھی اسی طرح خوش ہو جائیں اور آپ اپنے گھر جا سکیں۔ ٹھیک...؟''

''لیکن...''

''جی...؟؟؟'' اس نے تجسس سے میری جانب دیکھا اور تھرمامیٹر میرے منہ کی طرف لے کر آگے بڑھی۔

''کچھ نہیں'' میں نے آرام سے منہ کھول دیا اور تھرمامیٹر کو مضبوطی سے زبان کے نیچے دبانے کی کوشش کرنے لگی۔

☆☆☆☆☆

برگشتگی

تمام مسافر اپنی اپنی منزل پر اُتر چکے تھے۔ سید مزمل علی شاہ بڑی دیر سے اپنے آپ کو اتنی لمبی بس کا اکیلا مسافر سمجھ کر ایک خاص قسم کی مسرت میں ڈوبا ہوا تھا۔ اُسے ڈرائیور اور کنڈیکٹر اپنے غلام سے محسوس ہونے لگے تھے۔ جنہیں اُس نے بہت سستے میں خرید لیا ہو۔ اتنی بڑی بس، ایک ڈرائیور، ایک کنڈیکٹر اُسے ایک عام مسافر کے کرایے میں میسر آ گئے تھے۔ ابھی اُس نے کافی سفر طے کرنا تھا۔ وہ آخری منزل کا مسافر تھا۔ رات کا اندھیرا پھیلتا اور گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اُس نے گردن اُٹھا کر بس کی سکرین سے سڑک کو دیکھا۔ کالی سڑک پر روشنی کا پیلا دھارا تیزی سے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ سڑک سنسان تھی اس لیے ڈرائیور بھی بڑی رفتار سے آزادی اور بے خوفی سے بھول بیٹھا تھا۔ جیسے گاڑی خود بخود اُسے لیے جا رہی ہو۔ ڈرائیور کا سر بڑے کدو کی طرف اِدھر اُدھر لرز رہا تھا۔ سید مزمل علی شاہ نے اُسکا چہرہ دوبارہ دیکھا۔ ڈرائیور نے اپنے سر کے گنج کو چہرے کی گھنی اور لمبی داڑھی کے رعب میں چھپا رکھا تھا، وہ شکل سے توہمات کا شوقین اور مذہبی آدمی لگ رہا تھا۔ سید مزمل علی شاہ نے ڈرائیور کو دیکھ کر اندازہ لگایا کہ وہ کٹر بلکہ متعصب قسم کا مذہبی آدمی ہے۔ اس کی ماتھے کے بالکل اوپر مزاروں، زیارتوں اور پیروں فقیروں کی تصویریں لگی ہوئی ہیں۔ مزمل شاہ نے خود سے سرگوشی کی "اسی لیے کم بخت نے کوئی گانا نہیں لگایا۔ اندھیرے سناٹے میں بس دوڑتی جا رہی ہے۔ کاش کوئی ہلکی سی موسیقی کی آواز بھی ہوتی۔ تو سفر اور بھی مزے کا ہو جاتا" سید مزمل علی شاہ نے اپنے جوتے اُتارے بغیر ٹانگیں لمبی اور سیدھی کیں۔ اور تین آدمیوں کی نشست پر لیٹ کر اس نے شیشے والی کھڑکی سے ٹیک لگا لی اور پوری بس کا جائزہ لینے کے بعد اس نے کنڈیکٹر کو دیکھا۔ جو ڈرائیور کے بالکل پچھلی نشست پہ یوں بیٹھا ہوا تھا۔ جیسے کوئی معذور آدمی رفع حاجت کی تسکین سے گزر رہا ہو۔ اس نے اپنے دونوں گھٹنے سختی کے ساتھ ڈرائیور کی سیٹ سے جوڑ رکھے تھے۔ اس کا دھڑ چھپا ہوا تھا صرف گردن اور کندھے نمایاں تھے۔ سر دامن میں جھکا ہوا تھا، سید مزمل علی شاہ کو

کلیم خارجی

شک سا ہوا۔ اُس نے سیٹ سے اُٹھ کر کنڈ یکٹر کی طرف دیکھا۔ وہ دن بھر کی کمائی کو گن گن کر ان کی تہیں بنا کر اپنی قمیص کی جیبوں میں یوں ٹھونسے جا رہا تھا۔ جیسے کسی کی دسترس سے محفوظ کر رہا ہو۔ سید مزمل علی شاہ پرسکون ہو کر بیٹھ گیا۔ اور پھر دوبارہ اپنے آپ سے بولا، مزمل شاہ اگر کنڈ یکٹر نے اچھی خاصی کمائی کر لی ہے۔ تو وہ یقیناً اب مہربان اور پُرخلوص ہو جائے گا اور ڈرائیور تو شاید بس کہیں پھینک کر کسی زیارت یا پیر کی قدم بوسی کیلئے بے چین سا لگتا ہے، سید مزمل علی شاہ نے اپنے قریب کی کھڑکی کے شیشے سے پھٹا پرانا پردہ ہٹا کر باہر دیکھنے کی کوشش کی۔ اور پھر اپنی ڈھارس بڑھاتے ہوئے خود ہی بولا، Enjoy the Journey مزمل شاہ-----

اپنی خود کلامی پہ اُسے حیرت ہوئی۔ اور یہ حیرت اُسے گہری چپ میں دھکیلنے لگی، وہ سیٹ پر لیٹ کر سوچ میں پڑ گیا، آج تک جب بھی اس نے خود سے بات کی ہے خود کو مزمل شاہ کہہ کر پکارا ہے۔ پوچھنے پر وہ لوگوں کو مزمل شاہ نام ہی بتاتا چلا آ رہا ہے۔ اتنے بڑے نام سے اسکی عزت و تکریم اور دنیاوی، روحانی یا سماجی فائدے میں کیا اضافہ ہے۔ یہ ایک آدمی کی پہچان پر دو آدمیوں کا ٹھپہ کس لیے مارا گیا ہے۔ سید مزمل علی شاہ، اسکے ہونٹ اس نام سے پھڑپھڑائے۔ اور پھر مسکراہٹ سے اس کے ہونٹ ٹیڑھے ہو کر سکڑ سے گئے۔ جیسے سیٹی بجانے کی کوشش کر رہا ہو۔ یہ میں اپنے ساتھ کسی اور کا کوئی تعارف اور حوالہ بن کر کیوں جیے جا رہا ہوں۔ اُف یہ نام اور اتنا بھاری اور دیر تک پکارنے جانے والا نام، جبکہ اُسکے جاننے والے اُسے صرف مزمل کہہ کر بلا کر خوش ہو جاتے ہیں۔ اس نے جیب سے پن نکال کر اپنے سامنے والی سیٹ کی پشت پر دستخط کر کے اُسے غور سے دیکھا۔ ''یہ کیا مرے دستخط میں وہ آدمی ہی نہیں۔ جو مرے اندر چھپا بیٹھا ہے''۔ وہ چونک کر دوبارہ خود سے بولا تھا۔ اس نے پوری سیٹ پر دستخط کرنا شروع کر دیئے۔ کنڈ یکٹر کی للکار نے اُسے متوجہ کیا، جناب آپ کہاں اُتریں گے، پہلے تو مزمل شاہ چپ رہا پھر کنڈ یکٹر کی کیفیت بھانپتے ہوئے بولا۔ جہاں تمہاری بس کا آخری اڈہ ہے۔ میں نے وہیں تک جانا۔ اور پھر آہستگی سے بولا، برداشت کر کم بخت، جان چھڑانے کی فکر میں لگا ہوا ہے اُس کے جواب سے مطمئن ہو کر کنڈ یکٹر اُنڈتا لہراتا ہوا کھلی کھڑکیوں کو بند کر کے ان کے آگے بوسیدہ پردے سرکانے میں لگ گیا۔ پچھلی نشستوں سے کنڈ یکٹر کی زوردار آواز اُبھری تو مزمل شاہ نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کنڈ یکٹر کسی سوئے ہوئے آدمی کے سر پہ کھڑا شور

مچا رہا تھا۔ لمبوترے چہرے اور سیاہ رنگت والا بغیر کسی حیرت اور خوف کے سیٹ پر چوکنا ہو کر بیٹھ گیا، پھر کنڈیکٹر نے مزمل شاہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بلند آواز سے کہا، سُنیے صاحب یہ شخص کہہ رہا ہے کہ اُسے جہاں مرضی اُتار دو۔ کنڈیکٹر نے شاید یہ جملہ اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ سنا تھا۔ وہ بے بسی سے اُس کو گھورے جا رہا تھا۔ مزمل شاہ نے آواز بلند کرتے ہوئے کہا ''ان بڑے میاں کو یہاں میرے پاس لے آؤ''۔ کنڈیکٹر کے اشارے پر وہ بغیر کسی احتجاج اور مذمت کے اُٹھ گیا اور مزمل شاہ کی دستخط شدہ سیٹ پر آ بیٹھا۔ مزمل شاہ نے تحمل اور ہوش میں دیکھ کر اُس کے کان کے قریب جا کر اپنائیت سے کہا، تو بڑے میاں آپ گویا کہیں بھی نہیں جا رہے، اس نے چہرہ گھمایا تو مزمل شاہ اسکی پختہ عمر سنجیدگی اور سانولی رنگت کا رُعب دیکھ کر جھینپ سا گیا۔ اُسکے جڑے ہوئے پتلے پتلے سیاہ ہونٹ کھلے آپ بھی تو کہیں جا نہیں رہے، اسکی آواز کا ٹھہراپن اور لہجے کا بے تکلف انداز دیکھ کر مزمل شاہ اُس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ ''جب ہر جگہ ایک جیسے رشتے ناطے اور رویے ہوں ایک جیسی وارداتیں اور سودے بازیاں ہوں تو ہم کہاں جا سکتے ہیں'' اسکی بات سن کر مزمل شاہ کے تو جیسے کاندھے ہلکے ہو گئے۔ اور اُس کو اپنے اندر ایک عجیب سی خوشی کے اُبھرنے کا احساس ہونے لگا۔ مزمل شاہ اب احترام اور محبت سے اُسے دیکھنے کے بجائے، بھانپنے میں لطف لینے لگا۔ مزمل شاہ کو اس کے بولنے کا انداز حیران کیے ہوئے تھا۔ کہ وہ پھر بولا ''میرے بس میں ہو تو میں اس بس میں ہی بیٹھا رہوں اور چاہوں گا کہ یہ چلتی رہے لیکن یہ بس والے اکثر بے بس ہو کر کمینے ہو جاتے ہیں، جیسے ہی اس کا جملہ ختم ہوا، کنڈیکٹر نیند کے جھونکے لیتا ہوا ان کے پاس پہنچ کر بولا۔ ہم آپ کو بس کے اڈے پہ نہیں اُتار سکیں گے کیونکہ ہم نے اڈے سے پہلے پٹرول پمپ پہ بس کھڑی کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسی لیے چند قدم تک آپ کو پیدل جانا ہوگا۔ کنڈیکٹر اپنی طرف سے حکم دے کر سیٹ پہ جا بیٹھا۔

''چلو اچھا ہے تھوڑی دور پیدل چل کر ہم اپنے سوئے ہوئے پیروں کو پھر سے جگا لیں گے'' مزمل شاہ نے کنڈیکٹر کے ناگوار رویے کو ختم کرنے کے لیے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ تم ٹھیک کہتے ہو، لیکن دُور ونزدیک اُتر جانا۔ کوئی خاص مسئلہ تو نہیں ہے۔ مزمل شاہ کے ہم سفر نے اپنی پہلی بات کا پھر سے احساس دلاتے ہوئے کہا۔

''جب تک بس اپنے بس میں ہے سفر کرنے ہیں''۔ مزمل شاہ نے مشورہ دیتے ہوئے کہا آگے کیا ہوگا۔ میں اب اس فکر سے آزاد ہوتا

جارہا ہوں۔ تم کسی نئے تجربے کی غرض سے سفر پر نکلے ہو، اُس نے ہنستے ہوئے بے تکلفی سے کہا تو مزمل شاہ بھی ہنس پڑا۔

کنڈیکٹر نے واقعی اُنہیں اڈے سے کافی دُور اُتار دیا تھا۔ وہ کچھ دیر خاموشی سے چلتے رہے دُور سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بتا رہی تھیں کہ رات کا یہ پہر سونے والوں کیلئے گہری میٹھی نیند اور جاگنے والوں کیلئے کامیاب وارداتوں کیلئے سُود مند ہوتا ہے۔

جب اڈے کے قریب کے ہوٹلوں اور دُکانوں کی بتیاں نظر آئیں تو مزمل شاہ کے ہم سفر نے بڑے تحمل اور اعتماد سے کہا۔ دیکھو دوست اگر تمہارے اس سفر کا کوئی خاص مقصد تھا۔ تو تمہیں اسکی تکمیل کیلئے میری طرف سے آزادی ہے مجھے اپنے اوپر بوجھ یا رکاوٹ سمجھے بغیر، میری پرواہ کیے بغیر جہاں جانا چاہتے ہو۔ چلے جاؤ۔ میں تمہیں، مہربانی، خلوص، احسان اور انسانی ہمدردی کے تمام اُصولوں اور پابندی سے آزاد کرتا ہوں۔ کیونکہ میں تو کہیں آنے جانے کی فکر سے اب خالی ہو چکا ہوں۔ بس صبح کے نئے سورج کا تماشہ دیکھنے کے لیے چند لمحے کسی گوشے میں ٹھہروں گا۔

مزمل شاہ کو یوں لگا جیسے اس کے ہم سفر نے زندگی کی بے مقصدیت اور بے معنویت کو اس کے دل میں اُتار کر اُسے مزید بے خوف کر دیا ہے۔

میں آج ہی اسی شب کے اندھیرے میں نئے سفر پہ یوں نکلنے کیلئے تیار ہو چکا ہوں کہ عقب سے کوئی آواز میرے لیے مشکل پیدا نہیں کر سکتی۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تمہاری گفتگو اور عمدہ چائے کے ایک کپ کا مزہ لے کر توانائی حاصل کر لوں، مزمل شاہ نے اُسے مزید انکار کا موقع دیئے بغیر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور اُسے کھینچتا ہوا ایک ہوٹل میں لے گیا، ہوٹل تقریباً خالی تھا دو کرسیوں پر رکشہ ڈرائیور بیٹھے تھے۔ ہوٹل کا مالک ایک میز پر دونوں ٹانگیں پسارے، ٹی وی پر خوف اور مخالفتوں کے پھیلانے والے پروگرام دیکھنے میں مگن تھا۔ چائے کا آرڈر سنتے ہی وہ بڑے شوق اور پیشہ ورانہ خلوص سے اُٹھا۔ ''اصل میں میری جیب میں چند روپوں کا بوجھ مجھے ہلکان کیے جا رہا ہے۔ جو اب میری کسی سہولت کے کام آنے کے نہیں رہے۔ میں اُن کے بدلے آج آخری مرتبہ اچھی چائے پینا اور پلانا چاہتا ہوں'' مزمل شاہ کا لہجہ اب اُس کے کسی پرانے اور بے تکلف دوست جیسا ہو چکا تھا۔ چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے مزمل شاہ نے سوال کیا۔ تم کب سے سفر کی اس مہم میں ہو۔۔۔

بس آج صبح میں سچ مچ بے منزل و بے مقصد سفر کی ٹھان لی ہے، مجھے آج پتہ چلا کہ حرکت میرا وجود کرتا رہا۔ اور برکت کہیں اور جاتی رہی۔ چنانچہ آج سے میں نے حرکت

وبرکت کا یہ سلسلہ بدلنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔
مزمل شاہ اُسکی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اور چائے کا گھونٹ لینا بھول گیا۔
''چائے پیو، وقت کی ٹھنڈک اس میں نہ اُتارو۔ میں تمہیں تفصیل بتائے دیتا ہوں۔
اُس نے چائے کا کپ رکھتے ہوئے کہا جواب خالی ہو چکا تھا۔ اصل میں مسئلہ یوں تبدیل ہوا کہ میری فیکٹری والے کئی ماہ سے میرے پیچھے پڑے ہوئے تھے کہ میں اپنی شناخت، قابلیت اور استحقاق کے چند ایسے کاغذی ثبوت اُنہیں فراہم کروں جنکی روشنی میں وہ میری محنت کا معاوضہ اور دیگر مراعات کا تعین کرسکیں۔ سو مجھے اس سفر پہ نکلنا پڑا۔ مجھے اپنے بھائی کے پاس جانا تھا، جسے آج سے تین ماہ پہلے میں نے اُسے اسکی ضرورت کے تحت اپنا بریف کیس دے رکھا تھا۔ اُسی بریف کیس میں میری شخصیت اور لیاقت کے کاغذات تھے۔ میں نے اُسے کئی بار فون کیا کہ ڈاک کے ذریعے، کسی بندے کے ذریعے وہ رسیدیں بھجوائے۔ لیکن زندہ رہنے کی سرگرمیوں اور نفع نقصان کی جنگ میں وہ ایسا حواس باختہ ہو چکا ہے کہ وہ گزشتہ تین ماہ سے یہ چھوٹا سا کام روزانہ بھول جاتا ہے۔ لیکن اُسکی طرف جانے کیلئے بس میں بیٹھتے ہی میری روح جاگ اُٹھی۔ اور مجھ پہ ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ میں نے اُسے دبوچ کر اپنی باقی ماندہ زندگی پر پھیلانے کا تہیہ کر لیا۔ میں نے محسوس کیا کہ مسافر کی حیثیت سے میں کسی سے کچھ لینے دینے کے معاملے میں مجبور نہیں ہوں۔ مجھے اپنی شناخت اور قابلیت کے لیے کسی محنت اور تردد کی ضرورت نہیں۔ میرے ہونے نہ ہونے سے دوسروں کا کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ اب یوں ہے کہ میں جیسے خوف میں لپٹی ہوئی خواہشوں سے آزاد ہو کر ہلکا ہوا ہوں۔
اس نے اپنے دونوں ہاتھ کی انگلیاں آپس میں بھینچتے ہوئے مزمل شاہ کے چہرے پہ آنکھیں گھماتے ہوئے کہا۔ تم بور ہو رہے ہو۔ اور میں اپنی حماقت زدہ ماضی کی تصویر کشی کر رہا ہوں۔ اوہ نہیں نہیں، مزمل شاہ عقیدت کے جذبے سے بیدار ہو کر بولا۔ تم جو کچھ کہہ رہے ہو۔ میں یہی سننا چاہتا ہوں۔ اگرچہ تمہاری باتیں عجیب اور انوکھی ہیں۔ لیکن مجھے لگتا ہے مجھے ایسی باتوں کی بے حد ضرورت رہی ہے۔ میں تنگ گلیوں میں سے باہر نکلتا ہوا محسوس کر رہا ہوں۔
اُس نے قہقہہ لگا کر مزمل شاہ کے ہاتھ کی پشت پر ہلکی سے تھپکی دیتے ہوئے کہا میں بھی تم سے باتیں کر کے اپنے آپ کو کھولتا اور آزاد کرتا جا رہا ہوں۔ تھوڑی دیر وہ چپ رہا اور مزمل شاہ کے آخری گھونٹ کو اس کے حلق میں اُترتا دیکھ کر بولا۔۔۔ سفر پہ نکلنے سے پہلے مجھ پر ایک بھیانک قسم کا خوف طاری تھا۔

میں وقت اور حالات کے جائزے میں لگا رہا۔ جیسے میں کہیں بہت دُور کبھی نہ لوٹنے کا نکلنے والا ہوں۔ میں اپنے جانے اور واپس آنے کے ایسے منصوبے سوچتا رہا۔ جس میں میرے لیے کسی نقصان اور حادثے کا امکان نہ ہو۔ میرے دل میں یہ خوف دھڑکنے لگا تھا۔ کہ میرے چلے جانے کے بعد میرے پیچھے کوئی ایسا حادثہ ہو جائے گا جسے لوٹ کر سہہ جانے کی مجھ میں ہمت نہ ہوگی۔ یوں سفر پہ نکلنا مجھے ایسا لگتا تھا جیسے کسی جُرم کی سزا میں دیس نکالا ہو۔ اور اب مجھے یوں لگتا ہے جیسے لوٹ جانا، اب میری زندگی اور وجود کے لیے خطرناک ہوگا۔ حالانکہ میں کسی کا مقروض ہوں، نہ گنہگار۔ میں اپنے بچوں کو ان کی خواہش اور حیثیت سے زیادہ دے چکا ہوں۔ میری بیوی، اب مری عورت نہیں۔ اپنے بچوں کی ماں ہے جو ہر وقت اسکی خدمت اور سہولت کے لیے تیار رہتے ہیں اور وہ زندگی کی اس سرشاری میں میری ضرورت اب محسوس نہیں کرتی میرے حالات اب مجھے میرے ماضی سے دور لیے جا رہے ہیں۔ کیونکہ مجھے اپنے کل کی زندگی پہ غصہ بھی ہے اور ندامت بھی۔ جب میں اپنے جینے مرنے کے لیے چند کاغذات کا محتاج رہا۔ میں دوسروں کی دی ہوئی شناخت اور حیثیت میں مجبوری کی زندگی جیتا رہا۔۔ جہاں ہر شخص مجھے اپنی عینک سے دیکھ کر مجھ سے تعلق اور رشتہ بناتا رہا۔ اُف توبہ۔۔۔

مزمل شاہ نے اُف توبہ سن کر اپنی آنکھیں میچتے ہوئے کہا۔ مجھے تم اپنے بارے میں نہیں بلکہ میری گزری ہوئی زندگی کی فلم دکھا رہے ہو۔ میں اسی شہر کی کسی گلی میں بہت دُور کھل جاؤں گا۔ تم مجھ سے زیادہ ذہین اور بہادر رہے ہو۔ جبکہ لگتا ہے کہ ایک دیوار کی طرح جیتا رہا۔ جس پر ہر شخص اپنی پسند کا گیند پھینک کر اُسے بھنچ لینے کی مسرت حاصل کرتا رہا۔ ہر شخص کے پاس اپنی پسند، رنگ اور سائز کا گیند تھا مجھے یوں بھی لگتا ہے کہ میں بے جان و مقصد دیوار تھا جس سے ہر آدمی کا اپنا مقصد اور مفاد وابستہ تھا۔ کوئی مجھ سے ٹیک لگا کر کھڑا ہونا چاہتا تھا۔ کئی میرے ساتھ لپٹ کے روتے رہے۔ بہت سے میری اوٹ میں بیٹھ کر پیشاب کرتے رہے۔ رفع حاجت کرتے رہے اور مجھ پہ چوتڑ رگڑتے رہے۔ اب مجھے اپنے کاندھوں پر اُگتے ہوئے محسوس ہو رہے ہیں۔ وہ مزمل شاہ کو اپنے ساتھ اس قدر متفق پا کر ہنسنے لگا۔ اور اسکی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ مزمل شاہ نے ہوٹل والے کو آواز دے کر پیسے دینے چاہے۔ لیکن ہوٹل کے مالک نے بڑی احسان مندی سے کہا۔ جناب عالی آپ کے یہ دوست چپکے سے میرے کاؤنٹر پہ بہت زیادہ پیسے رکھ آئے تھے۔ میں پہلے سے زیادہ عمدہ چائے دوبارہ بنا کر پیش کر سکتا ہوں۔ تمہاری چائے واقعی عمدہ تھی۔ مزمل

شاہ نے اُسے جواب دیتے ہوئے جیسے خود سے بات کی۔ یہ خدمت اور محنت سے پہلے اجر پا لینے کا مزہ بھی کمال ہے---

صبح ہونے میں چند گھنٹے ہیں۔ اس نے مزمل شاہ کو ہوٹل والے سے مزید گفتگو سے روکتے ہوئے کہا میں تو اب گم ہو جانے کے سفر پہ ہوں۔ اور گم ہو جانے کی ایسی خواہش میں ہوں۔ کہ مجھے ڈھونڈنے والے دُکھ اور ناکامی کے احساس کے بغیر مطمئن ہو کر مجھے پا لینے کی اُمید سے دست بردار بھی ہوتے چلے جائیں گے۔

صبح ہونے سے پہلے، اور تم پر بوجھ بنے بغیر، تم سے بچھڑنے سے پہلے، میں مسرت کے تجربے میں تمہیں شریک کر کے اُٹھوں گا۔

مزمل شاہ نے گویا اپنے اور اس کے درمیان آئندہ کے سفر اور فیصلے کا اعلان کرتے ہوئے کہا۔ میں دراصل اسی شہر میں آنا چاہتا تھا مجھے میرے پرانے اور گہرے دوست نے بلوایا تھا۔ کیونکہ میں کئی دن سے بلکہ سالوں سے وہ اُدھار کی رقم مانگ رہا تھا۔ جو اس نے تقریباً چار سال پہلے دو ماہ کے مرحلہ میں واپس کرنے کی یقین دہانی پہ مجھ سے حاصل کی تھی۔ اس نے اپنے بیٹے کے لیے نئی کار خریدنی تھی۔ سو اس نے مجھ سے روپے مانگے اور میں نے اُسے تین لاکھ روپے تھما دیئے۔ اس سارے عرصہ میں اُس سے رقم ہی مانگتا رہا۔ اور وہ مجھے ٹالتا رہا۔ کل تنگ آ کر اس نے مجھے فون پر اپنے ہاں بلایا تا کہ مجھے میرا قرض واپس لوٹا دے۔

مزمل شاہ کی بات سن کر وہ بولا۔ ''اپنی رقم واپس لے کر۔ تم اس کا کیا انوکھا استعمال کر پاؤ گے۔ تم ان روپوں سے ایسا کیا کچھ خرید لو گے۔ جسکی تم آئندہ خریدنے کی پھر ضرورت نہ رہے۔ روپوں سے ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں۔ محتاجی بڑھتی رہتی ہے۔ میں تو عمر بھر اس تنگ ودو میں لگتا ہی رہا کہ کوئی ایسی شے خرید لوں۔ جو مستقل اور ابدی طور پر مجھے محتاجی سے محفوظ رکھ پائے۔ لیکن میں تو ناکام ہی رہا۔ تو کیا اب تم اپنے مقروض دوست کے ہاں جاؤ گے''؟ میں نے ابھی ابھی دریافت کر لیا ہے کہ ضرورت کی چیزیں، اور رشتے ناطے کبھی بھی ہمارے لیے کافی اور مکمل نہیں ہوتے۔ ہم ان کے عادی، غلام اور قابل رحم محتاج ہوتے ہیں۔ یہ کہہ کر مزمل شاہ نے اپنے پہلو کی جیب سے ایک سادہ سا موبائل فون نکالا۔ اور نمبر ڈائل کر کے موبائل فون کو کان سے لگاتے ہوئے، مسرت سے اپنے ہم سفر کی دلچسپی کا تماشہ دیکھنے لگا۔

دوسری طرف سے بغیر کسی رسمی جملے کی آواز اُبھری۔ کم بخت، ذلیل آدمی تم ابھی تک آئے نہیں، ہم تمہارے انتظار میں بیمار پڑ گئے ہیں، کمینے آدمی جلدی آؤ تمہارا دیا ہوا اُدھار میرے پورے وجود کو دبائے بیٹھا ہے۔

رضوان اب میں تم کو دیا ہوا اُدھار واپس نہیں لے سکتا، مزمل شاہ نے سر سے بوجھ اُتر جانے

والے آواز اور پرسکون لہجے میں کہا۔ کیا بھونک رہے ہو، جلدی پہنچو ورنہ میری ہڈیاں چیخ جائیں گی۔ بے تکلفی کے لہجے میں ڈوبی ہوئی رضوان کی ڈانٹ گونجی، مزمل شاہ کا ہم سفر اپنے کانوں کی توانائی استعمال کیے بغیر رضوان کی گفتگو سنے جا رہا تھا۔

اصل میں بات یہ ہے --- رضوان، مزمل شاہ کی آواز اور گفتگو کے الفاظ بدلنے لگے۔

کہ تم نے زندگی کے کئی کمزور کر دینے والے دنوں میں میرا ساتھ دیا ہے۔ مجھے تمہاری پرخلوص دوستی نے بچائے رکھا ہے۔ تمہارے کچھ احسانات تو ایسے ہیں کہ جس کا بدلہ چکانا۔ میرے بس میں ہی نہیں دُنیا کی اس بھیڑ بھاڑ میں تم مجھے میرے کھوئے سرمایے کی طرح ملتے رہے ہو--- تمہارا ہونا اور تمہارا ساتھ میرا پرانا رشتہ روپے پیسے، اور دُنیاوی مال و دولت کے مقابلے میں کئی گنا اہم اور قیمتی ہے۔ میں جس طرح تم سے رقم مطالبہ کرتا رہا ہوں۔ اُس کے لیے میں اپنے ضمیر اور تمہارے سامنے بے حد شرمندہ ہوں۔ میں آج ایسا جاگا ہوں کہ اب سونے کا نہیں رہا۔ تم مجھے اپنا بھائی سمجھتے ہو۔ تمہاری بیوی میری پرخلوص اور مہربان بھابی ہے۔ وہ مجھے اپنے تمام رشتوں سے زیادہ عزت دیتی ہے۔ مجھ پہ بھروسہ کرتی ہے۔ تمہاری بیٹیاں اور تمہارے بیٹے میرے ساتھ تمہاری دوستی پر اتنا فخر کرتے رہے ہیں۔ کہ گویا میں پوری دُنیا میں اکیلا ان کی کفالت کرتا رہا ہوں۔ سو اتنے بڑے سرمایے کے ہوتے ہوئے مجھے اب اور کیا چاہیے۔ لہٰذا میں تمہیں اپنی طرف سے ہر قرض سے آزاد کرتا ہوں۔ تم اور تمہارا کنبہ اس سے زیادہ کا مستحق تھا میں نے بہت تھوڑا کیا۔ یہی میری استعداد میں تھا۔

دوسری طرف سے بے یقینی میں ڈوبی ہوئی چند آوازیں اُبھریں۔ پھر رونے کی سسکیاں سنائی دیں اور جذبات سے بھری چند چیخیں سنائی دیں۔ مزمل شاہ خوشی، حیرت اور دُکھ کے ملے جلے جذبات کا زیادہ سامنا نہ کر پایا۔ اس نے موبائل فون بند کر کے میز پر پھینک دیا۔

مزمل شاہ کے ساتھ بیٹھا ہوا ہم سفر کچھ دیر خلاؤں میں گھورتا رہا۔ تمہارے تماشے اور تمہارے دوست کے جذبات نے تو میری آنکھیں بھر دی ہیں۔ ''لگتا ہے --- تم پوری دُنیا کے گرد گھوم پھر کے مزے اُڑاؤ گے --- چلو اب اُٹھتے ہیں اور ان لوگوں کی کھوج میں نکلتے ہیں۔ جو ابھی تک ہمیں نہیں ملے''۔

سڑکوں پہ وقت سے پہلے صبح کو گھسیٹ کر دوڑانے والی گاڑیاں چیخنے لگی تھیں۔ لیکن وہ دونوں ایک پرانی اور خاموش گلی میں داخل ہو گئے۔ جہاں رات گئے کا اندھیرا اور سکون ابھی باقی تھا۔

☆☆☆☆☆

انتظار

انعام الحسن کاشمیری

بوسیدہ چارپائی پر دیر تک کروٹیں بدلنے کے بعد بھی جب اُس کے گوشت پوست سے خالی، ہڈیوں کا ڈھانچہ بنے جسم کو راحت میسر نہ آسکی، تو وہ اٹھ گئی۔ سامنے چولہے کی راکھ میں چند چنگاریاں سلگ رہی تھیں جو رات کی تاریکی میں چمکتے جگنوؤں کی طرح دکھائی دیتی تھیں۔ گھپ اندھیرے میں اندازے سے زمین پر پاؤں اِدھر اُدھر مار کر جوتیاں تلاش کیں اور پھر قدم چولہے کی جانب بڑھا دیے۔ بان کی رسیوں پر سے، جو ڈھیلی پڑ چکی تھیں، اُس کا ہلکا پھلکا وجود اٹھا تو چارپائی کی پٹیوں میں سے چرچرانے کی آوازیں پورے کمرے میں مرتعش ہوگئیں جس نے رات کے گہرے دبیز خوفناک سناٹے میں کسی جنگلی جانور کی چیخ کا روپ دھار کر ماحول کو اور زیادہ وحشت ناک بنا دیا لیکن اُسے کوئی خوف محسوس نہیں ہوا۔ چھوٹے سے گھر کے چھوٹے سے کمرے میں وہ تنہا تھی اور اس کا لاغر و نحیف جسم برسوں کی گرمی و سردی، موسموں کے تغیر و تبدل اور زمانے کے نشیب و فراز سہتے سہتے اب ہر قسم کے خوف، ڈر اور فکر سے بے نیاز ہو چکا تھا۔

چارپائی سے اٹھتے وقت اس نے اپنے ہاتھ کی پشت سے آنکھوں کو مسلا تاکہ وہ اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو جائیں

اور پھر ایک طویل آہ بھرتے ہوئے قدم چولہے کی جانب گھسیٹنے لگی۔ اس کا ایک ہاتھ آگے کی جانب کو نکلا ہوا تھا تاکہ وہ راہ میں آنے والی کسی چیز سے ٹکرا کر اُسے پیشگی مطلع کر کے چوٹ لگنے سے محفوظ رکھ سکے۔ دوسرا ہاتھ خمیدہ کمر کی پشت پر ٹکا ہوا تھا۔ چولہا کمرے کے ایک کونے میں تھا لیکن تاریکی کے باعث اُسے وہاں تک پہنچنے میں خاصی دیر لگ گئی۔ چنگاریوں نے، جواب بجھنے کے قریب تھیں، اس کی رہنمائی کی اور آخرکار وہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئی۔ چند سوکھی ٹہنیاں چولہے میں جھونک کر اس نے بمشکل ماچس تلاش کی اور پھر تھوڑی دیر بعد اس کی مسلسل پھونکوں کے نتیجے میں آگ دھیرے دھیرے سلگنے لگی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور اس کے جسم کی ہڈیاں اور ان کے جوڑ گویا برف کی سل بن چکے تھے لیکن اس کے باوجود مزید جینے کی تمنا نے اُسے آگ جلانے کے قابل کر دیا تاکہ وہ اِس سے زندگی کی حرارت پا سکے۔

دھیرے دھیرے جل اٹھنے والی آگ نے پورے کمرے کو روشن کر دیا۔ اُس کے اپنے وجود کے سائے مٹی کی کچی دیواروں پر ہیبت ناک تصویریں بنانے لگے جو کسی لمحے کسی شاخ کے تڑخ کر جل اٹھنے کے دوران کوئی دوسرا روپ دھار لیتے۔ اُس نے جلدی سے اپنے لرزاں ہاتھوں کو شعلوں کے اوپر رکھ دیا اور جب ان کا ارتعاش کسی قدر تھما تو اس نے اپنی پیٹھ آگ کی جانب موڑ لی اور اِسے سینکنے لگی۔ جلد ہی جسم کے اندر جمی برف پگھل کر بہہ گئی اور کافی دیر سے لرزنے والے وجود کو سکون محسوس ہونے لگا۔ جسم کو راحت آشنا کرنے کے بعد اس کا دماغ ماضی کے دریچوں میں جھانکنے لگا۔ چولہے میں کسی لمحے کوئی آنچ تیز ہوتی تو اُسے زیادہ حرارت محسوس ہونے لگتی اور جس لمحے کوئی شاخ جل کر ٹوٹتی تو اس کی آواز اُس کے سوچنے کے تسلسل کو کسی قدر جھنجھوڑ ڈالتی۔ وہ کبھی اپنے بچپن، جوانی اور ادھیڑ عمری کے باغوں میں جا گھستی اور کبھی اپنے اکلوتے بیٹے کے بچپن، لڑکپن اور جوانی کی پگڈنڈیوں پر اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے اُسے پکڑنے کی کوشش کرتی۔ اِس بھاگ دوڑ میں وہ کسی مچھلی کی طرح پھسل کر ہاتھوں سے نکل جاتا اور کبھی اس کی نرم و نازک کلائی اس کے مضبوط ہاتھوں میں آجاتی تو وہ بے حد مسرور ہوجاتی اور پھر اسے اٹھا کر اپنے سینے کے ساتھ سختی سے بھینچ ڈالتی اور اس کے سرخ سرخ گالوں کو دیوانہ وار چومنے لگتی۔ وہ اپنے ہونٹ اس کی پیشانی پر رکھ دیتی اور جب تک وہ خود تنگ آ کر اپنا منہ اس کے لبوں سے الگ نہ کرتا، وہ اسی طرح اپنی محبت والفت کی آبشار کو اس کے اوپر نچھاور رکھتی یہاں تک کہ وہ اس کی گود میں سے اتر کر دوبارہ پگڈنڈی پر دوڑنے لگتا اور اُسے پکڑنے کے لیے وہ پھر سے اُس

کے پیچھے بھاگنے لگتی۔
چولہے میں جس لمحے شعلے دھیمے ہونے لگتے، اور ٹہنیوں کے چٹخنے کی آوازیں دم توڑنے لگتیں، تو وہ مزید لکڑیاں آگ میں جھونک دیتی۔ اُسے معلوم تھا کہ چولہے کے پاس جمع کی گئی لکڑیاں جلد ہی ختم ہو جائیں گی اور رات کے اِس پہر جبکہ باہر کڑاکے کی سردی پڑ رہی ہے اور کہر نے ہر شے کو ملفوف کر رکھا ہے، صحن میں سے لکڑیاں اٹھا کر لانا بے حد مشکل کام ہے۔ وہ ہر روز گاؤں کی گلیوں، پگڈنڈیوں، کھیتوں اور قبرستان میں سے درختوں کی ٹوٹی ہوئی ٹہنیاں اور راستے میں بکھری ہوئی لکڑیوں کے ٹکڑے وغیرہ اٹھا کر لے آیا کرتی تھی تا کہ ان سے ایندھن کا کام لیا جا سکے۔ اس کے ناتواں وجود کے لیے یہ بڑا کٹھن اور مشقت طلب کام تھا لیکن اس کے بغیر کوئی چارہ کار بھی نہیں تھا۔ کبھی کبھار جب موٹے تنے والی کوئی ٹہنی ہاتھ لگتی تو وہ پڑوس کے بچوں سے کہلوا کر اٹھوالاتی۔ گرمیوں کے موسم میں کسی نہ کسی طرح کام چل جاتا لیکن سردیوں میں اس کے بغیر گزارے کی کوئی صورت دکھائی نہ دیتی تھی۔ شدید سردی اور خنکی میں جسم کو برف کی سل بننے اور ہڈیوں کے گودے کو جمنے سے بچانے کے لیے اس حد تک گرمائش کی ضرورت پڑتی تھی جو خون کی روانی کو برقرار رکھ سکے۔ خون کی یہی روانی زندگی کی علامت تھی۔

جاڑا ہر بار ایک عذاب کی صورت آیا کرتا تھا لیکن اِس بار اس کی شدت پچھلے برسوں سے دو آتشہ تھی۔ کیا ٹھنڈ اس بار زیادہ پڑی ہے یا میری ہڈیوں میں اس کو برداشت کرنے کی قوت کم ہو گئی ہے؟ وہ اپنے آپ سے سوال کرتی اور کوئی جواب نہ پا کر دوسری عورتوں سے پوچھنے لگتی۔ وہ ماسی رحمتے کی بات سن کر اپنی جرسیوں کو اپنے جسموں کے ساتھ اور زیادہ سختی سے بھینچتیں اور اپنی موٹی موٹی چادروں کے پلوؤں کو اور زیادہ کھینچتے ہوئی کہتیں: ''ماسی! بس نہ پوچھو، ایسا لگتا ہے جیسے کئی برسوں کی ٹھنڈ ایک بار ہی پڑ گئی ہے۔ دانت سے دانت بج اٹھتے ہیں اور رات کو بستر پر پاؤں دراز کرنے کی ہمت ہی نہیں پڑتی اور پنڈلیاں تو رانوں سے جدا ہی نہیں ہوتیں۔'' تب ماسی رحمتے سوچتی کہ میری ہڈیاں ابھر آئی ہیں اور ان پر چڑھا ماس گل گیا ہے تب ہی میں اپنی ٹانگیں سکیڑ کر اور پنڈلیوں کو رانوں سے لگا کر حرارت لینے کی کوشش کرتی ہوں تو حدت کا کوئی لمس میرے جسم کے قریب پھٹکنے پر تیار نہیں ہوتا۔ دن اِدھر اُدھر کے کاموں، گھومنے پھرنے، اپنی عمر کی بڑی بوڑھی عورتوں سے باتیں کرنے اور لکڑیاں وغیرہ جمع کرنے میں گزر جاتا۔ ایسے میں مسلسل حرکت کرتے رہنے کے باعث یخ بستگی جسم میں اترنے میں ناکام رہتی۔ شام کو جب سورج دور رافق کے پار اپنی آنکھیں موندتا اور اس کی حدت

آمیز کرنیں سورج کی آغوش میں اپنے پر پھیلا کر سو جاتیں تو رات کے دوش پر سوار ہو کر آنے والی ٹھنڈ کے ساتھ ساتھ زمین بھی اپنے جبڑے کھول کر سرد سانسیں اگلنے لگتی جو کہر کے روپ میں ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے کر ماحول کو قلفی کی طرح جما دیتیں۔

بیٹھے بیٹھے جب وہ تھک گئی تو اس نے اپنے اوپر لپٹے پھٹے پرانے، بوسیدہ اور میلے کچیلے کمبل کو اتار کر زمین پر پھیلا دیا اور اپنے ایک بازو کو تکیہ بنا کر اس پر لیٹ گئی۔ چولہا چہرے کے بالکل سامنے تھا جس میں سے اٹھنے والی آگ کی نیلی پیلی اور سرخ لپٹوں کو وہ بآسانی شناخت کر سکتی تھی۔ ان لپکتے اور پھر مدھم ہوتے شعلوں کو دیکھ کر وہ سوچنے لگی کہ زندگی بھی ان شعلوں کی ہی مانند ہے جو کبھی جوانی کے روپ میں لپک لپک کر اپنی تابانی اور جولانی کا منظر پیش کرتی ہے اور کبھی بڑھاپے کی صورت میں بجھتی چنگاریوں کا روپ دھار کر مدھم سروں میں سسکاریاں بھرتے ہوئے آخر راکھ کی صورت اختیار کر کے بالکل فنا ہو جاتی ہے۔

تو کیا زندگی کی کہانی بس اتنی سی ہے کہ ایک شعلہ بھڑکا، لپکا اور پھر بجھ گیا اور اپنے پیچھے کریدنے کے لیے راکھ چھوڑ گیا؟ راکھ! جس کا کوئی مصرف نہ پا کر آخر کار گلی کے نکڑ پر یا کھیت کی مینڈ پر پھینک دی جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ایک بھرپور آتش زندگی کی شعلہ فشاں کہانی کا اختتام ہو جاتا ہے۔

اُس نے بڑی شاخوں کے درمیان میں ایک ننھی سی، نرم و نازک ٹہنی کو سلگتے دیکھا تو اُسے عبدل یاد آ گیا۔ ایک وقت تھا کہ وہ بھی اس ننھی سی ٹہنی کی طرح نرم و نازک اور دل گداز تھا۔ اس کے گال خوب بھرے ہوئے تھے اور اس کا جسم اس حد تک گداز انگیز تھا کہ جیسے ریشمی لحاف ہو یا روئی کے گالوں کا ڈھیر۔ ذرا سی لو چلتی یا سردیوں کی تیز ہوا تو اُس کی نکسیر پھوٹ پڑتی یا سرسام ہو جاتا۔ ایسے میں وہ سب کام چھوڑ کر عبدل کی تیمارداری میں مصروف ہو جاتی۔ شوہر کے دنیا سے گزر جانے کے بعد اب عبدل ہی اس کے لیے زندگی گزارنے کا واحد سہارا تھا اور جس کو دیکھ کر اُسے اپنے وجود میں زندگی کی حرارت محسوس ہوتی اور سانسیں چلتی ہوئی معلوم ہوتیں۔ اُس کی نمود میں اُس کی اپنی زندگی کے ماہ و سال کا خلاصہ قید تھا۔ لوگوں کے گھروں کے برتن مانجھتے، میلے کچیلے کپڑے دھوتے اور صفائی کرتے وقت عبدل ہی اس کی آنکھوں کے سامنے موجود ہوتا یا پھر ایک پھانس بن کر اس کے دل میں موجود رہتا جس کے زخم سے رسنے والا لہو دھیرے دھیرے اس کی ناتوانی اور پشیمانی کو اور بڑھا دیتا تو وہ دوڑتی ہوئی گھر جاتی اور عبدل کو اپنے ساتھ چمٹا کر اس کی بلائیں لیتی، اُسے خوب چمکارتی اور پھر جھولنے میں چھوڑ کر دوبارہ کام پر چلی جاتی۔ جب عبدل چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو وہ اُسے بھی

اپنے ساتھ لے جانے لگی جہاں ننھا سا وجود اپنی کلکاریوں میں مگن رہتا اور وہ اپنے کام میں مصروف!!

اچانک ایک شعلہ خوب بھڑکا اور تیزی کے ساتھ اس کے چہرے کی جانب لپکا جس کی حدت اُس نے جلن کی صورت محسوس کی لیکن وہ بدستور اپنی جگہ ہی لیٹی رہی۔ اُسے معلوم تھا کہ کسی لمحے کوئی شعلہ تیزی پکڑ کر اس کو اپنی لپیٹ میں لینے کی کوشش کرسکتا ہے اور ایسی کڑاکے دار سردی میں جب ہڈیوں کا گودا تک جم گیا ہو، شعلے کی یہ شرارت بری معلوم نہیں ہوتی۔

عبدل کی یادیں اِن شعلوں کی مانند ابھر ابھر کر اس کے دل و دماغ کے دریچوں میں گھسنے کی کوشش کرنے لگیں۔ اُسے یاد آیا کہ ایک بار جب وہ اپنے کام میں مصروف تھی اور عبدل اپنے ننھے ننھے پاؤں گھسیٹتے ہوئے گھر سے باہر نکل کر گاؤں کی کچی گلی بھی پار کر گیا تو اس کا وجود خزاں رسیدہ پتے کی مانند بکھر کر رہ گیا تھا۔ کتنی دیر تک اُسے ہوش نہیں آیا اور جب ایک عورت نے ننھے عبدل کو لا کر اس کی آغوش میں ڈالا تب اپنی جان کی حرارت اپنے جسم میں محسوس کرتے ہوئے اس کے دل کی دھڑکن چلی اور اُس میں زندگی کی رمق روشن ہوئی۔ اور جب عبدل نے کچھ اور بڑے ہونے کے بعد ایک دن اُس سے گاؤں کے باہر دور تک پھیلے کھیتوں کے پار چھوٹی سی پہاڑی پر اپنے ہم جولیوں کے ساتھ جا کر کھیلنے کی فرمائش کی تو اس نے اِس ڈر سے اِسے اجازت نہ دی کہ اتنے دور تک چلنے سے اس کی ٹانگیں تھکن سے چُور ہو جائیں گی اور پھر یہ بھی کہ وہ اس کے بغیر اتنی دیر تک کیسے رہے گی لیکن ایک دن جب عبدل کچھ اور بڑا ہو گیا، تو وہ اُس سے پوچھے یا اُسے بتائے بغیر اپنے دوستوں کے ہمراہ ساتھ والے گاؤں میں پیر مہر علی بخاری کے عرس پر لگا میلہ دیکھنے چلا گیا اور شام ڈھلے واپس آیا تو وہ اس کے انتظار میں گاؤں سے باہر کھیتوں کے کنارے بیری کے درخت سے ٹیک لگائے سارا وقت بیٹھی رہی اور جب شام کے دھندلکے میں اُسے اپنے عبدل کا تکان زدہ چہرہ دکھائی دیا تو وہ اُسے اپنے کاندھوں پر اٹھا کر گھر لے آئی۔ ہاتھ منہ دھلا کر جلدی جلدی کھانا کھلایا اور پھر بستر پر لیٹا کر اس کی ٹانگیں دبانے لگی۔ وہ عبدل کا چہرہ دیکھتے ہی بھول گئی تھی کہ اُس نے اس کی واپسی پر بن بلائے چلے جانے کی پاداش میں دھنائی کرنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ اور جب وہ عبدل کے ساتھ ہی لگ کر سونے لگی تو اس نے یہ سوچ کر عبدل کی بند آنکھوں پر طویل بوسہ دیا کہ میں بھی کتنی پاگل اور نادان ہوں، یہ عبدل اگر مجھ سے جانے کا پوچھتا تو میں ہرگز اُسے جانے نہ دیتی اور صبح اٹھتے ہی اس نے عبدل کو یہ بات سمجھائی کہ جہاں بھی جانا ہو جاؤ لیکن مجھے بتا کر جایا کرو تاکہ میں

تمھارے انتظار میں ہلکان نہ ہوا کروں اور تب ننھے عبدل نے اپنی نازک بانہیں اپنی ماں کے گلے میں ڈال دیں اور معصوم سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کے رخساروں کو چومتے ہوئے باہر کی جانب بھاگ گیا۔

غیر شعوری طور پر اس نے اپنے ہاتھ سے اپنے رخساروں کو چھوا جہاں جھریوں بھری جلد لٹک رہی تھی۔ اپنا ہاتھ دیر تک رخساروں پر رکھے عبدل کے نرم و گداز بوسے کا لمس محسوس کرتے کرتے اس کی آنکھوں میں آنسو اتر آئے جو اس کے رخساروں پر پھیلی جھریوں بھری بھول بھلیوں میں راستہ تلاش کرتے ہوئے کچی مٹی کے فرش میں جذب ہونے لگے اور جو قطرے اس کے ہونٹوں پر ٹھہر جاتے، وہ انہیں پی لیتی اور ان کی نمکینی سے اپنے دل میں جلنے والی آگ کی لو کو مدھم کرنے کی رائیگاں کوشش کرتی۔ عبدل کی یاد میں یہ آنسو صرف آج ہی نہیں بہے تھے، اُسے یاد آیا کہ عبدل کے لیے اس نے اپنی زندگی میں نجانے کتنی بار آنسو بہائے۔

جب کبھی عبدل کو تکلیف ہوتی یا جب کبھی سکول میں ماسٹر جی اپنی بید کی چھڑی سے مارتے ہوئے اس کی کمر پر سرخ لکیریں کھینچ ڈالتے تو وہ رونے لگتی اور روتے روتے اس کے آنسو خشک ہو جاتے۔ وہ سوچنے لگی کہ جب کبھی عبدل اسے بتا کر یا بتائے بغیر گاؤں سے باہر گیا، اُس نے رو پیٹ کر خود کو خوب ہلکان کر ڈالا لیکن جب عبدل بڑا ہو گیا اور اس کی اجازت لے کر نوکری کی تلاش میں شہر جانے لگا تب اس نے مسکراتے ہوئے اسے الوداع کیا تھا۔ اس الوداعی منظر کا ایک ایک نقش اس کے ذہن میں بالکل اس طرح تازہ تھا جیسے ابھی یہ کل ہی کی بات ہو حالانکہ اِسے کم از کم دس برس بیت گئے تھے۔ اس کے لیے عبدل ابھی بھی ننھا سا بچہ تھا، جس کی عمر اب تیس برس سے کچھ اوپر ہو چکی ہے۔

گاؤں کے سکول سے پانچویں اور چھ کوس دور دوسرے گاؤں کے سکول سے آٹھویں جماعت پاس کرنے کے بعد عبدل کے لیے گاؤں کی گلیوں، کھیتوں کی مینڈوں اور پگڈنڈیوں پر آوارہ پھرتے رہنے کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔ وہ خود بھی گھروں میں محنت مزدوری کرتے ہوئے نحیف و لاغر ہو چکی تھی اور شدت سے متمنی تھی کہ عبدل کہیں کام پر لگ جائے تا کہ وہ سکھ کا سانس لے سکے۔ عبدل نے چودھری غلام حسین کے کھیتوں پر کام کرنا شروع کر دیا لیکن یہ اُسے راس نہ آیا۔ چند دن کی مشقت نے اس کے چہرے کو زردی مائل کر دیا اور اس کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے۔ یہ دیکھ کر وہ تڑپ اٹھی اور جب ایک پڑوسی نے اُسے صلاح دی کہ عبدل کو شہر بھیج دو جہاں آٹھویں جماعت پاس والوں کے لیے کرنے کے بہت سے کام ہیں، تو اس نے اِسی لمحے عہد کر لیا کہ وہ جیسے تیسے کر کے

روپے جمع کر کے عبدل کو شہر بھجوانے کا انتظام کرے گی۔ یہ ارادہ اگرچہ اس کے ڈھلتے وجود پر پتھر کی بھاری سل ثابت ہوا لیکن اس کے باوجود اس نے چھ مہینوں ہی میں اتنے روپے جمع کر لیے جو شہر کے زادِ راہ کے لیے کافی ہوتے۔ اور جب وہ انہیں عبدل کے ہاتھوں میں دے رہی تھی تو اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اپنی زندگی کے طوطے کو عبدل کے ہاتھوں میں مقید کر رہی ہے جس کے اندر اُس کی جان ہے کہ یہی ہاتھ شہر میں جا کر محنت مزدوری کریں گے تو اس کے لیے زندگی کے آخری دن سکون کے ساتھ گزارنا ممکن ہوگا۔ عبدل کو پریشانی سے بچانے کے لیے وہ زبردستی مسکراتی اور ہنستی رہی اور جب اُسے گاؤں سے باہر آ کر تانگے پر بٹھایا اور اُس کی پیشانی پر طویل بوسہ دے کر رخصت کیا تب بھی وہ مسکراتی رہی اور جب گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سماعت کے حصار سے پرے ہو چکی اور تانگہ نظروں سے اوجھل ہو گیا، تب بھی وہ شاداں و فرحاں کافی دیر وہیں بیٹھی رہی اور اُس جانب دیکھتی رہی، جدھر کو شہر کا راستہ جاتا تھا اور جب سورج ڈھلنے لگا، تب وہ واپس گھر لوٹی۔ عبدل کے بغیر سُونا سُونا گھر اُسے کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا لیکن اُس نے زبردستی اپنی تنہائی اور اپنی وحشت کو اپنی امید کے زور پر دبائے رکھا۔

عبدل تین ماہ بعد شہر سے لوٹا۔ اُسے ایک جگہ پر کام مل گیا تھا اور جب اُس نے واپسی کے لیے پیسے جمع کر لیے تب اُس نے گاؤں کی راہ لی۔ وہ اُس کے لیے چمکیلے کپڑوں کا ایک جوڑا، پشمینے کی ایک چادر بھی لایا اور انگلی بار جب وہ آیا تو چھ پیالیوں کا ایک سیٹ بھی خرید لایا جسے اُس نے چولہے کے اوپر کارنس پر سجا دیا تھا۔ پیالیوں کا خیال آتے ہی اُس نے لیٹے لیٹے ہی اپنا سر اٹھا کر چولہے کے اوپر بنی کارنس کی جانب دیکھا جہاں چھ کی چھ پیالیاں اسی طرح دھری تھیں۔ وہ سفید رنگ کی تھیں جن کے اوپر سنہری رنگ کے نقش و نگار بنے ہوئے تھے لیکن کافی عرصہ سے استعمال نہ ہونے کے باعث گرد و غبار اور لکڑیوں کے دھوئیں نے یہ سنہری نقش و نگار خاکستری رنگ میں مدغم کر دیے تھے۔ پیالیوں کو دیکھ کر اُس کے ہونٹوں نے جنبش کی جیسے وہ انہیں اپنے لبوں کے ساتھ لگا کر ان کے لمس کو اپنے وجود میں اتارنے کی کوشش کر رہی ہو جنہیں عبدل کے ہاتھوں نے چھوا ہے۔ ابھی وہ پیالیوں کو پیار بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی کہ اُسے خیال آیا کہ ایک بار عبدل اُس کے لیے سلائی مشین بھی لایا تھا تاکہ وہ لوگوں کے گھروں میں جا کر کام کرنے کے بجائے اپنی ہی گھر میں بیٹھ کر کپڑے سلائی کر کے وقت گزاری کے ساتھ ساتھ تھوڑے بہت پیسے بھی کما لیا کرے۔ یہ سلائی مشین اس نے کبھی استعمال نہیں کی کیونکہ وہ کپڑے

سلائی کرنا نہیں جانتی تھی لیکن اس کے باوجود اس نے دوسری عورتوں سے پوچھ پوچھ کر عبدل کے لیے ایک سوٹ کی کسی طرح کتر بیونت کر لی اور جب وہ اُس نے اُسے دیا تو اس نے پہننے کے بجائے بیگ میں رکھ لیا کہ شہر جا کر درزی سے ٹھیک کروا کر پہن لوں گا۔ اِس کے بعد اس نے سلائی مشین کپڑے میں باندھ کر اپنی چارپائی کے نیچے رکھ دی جو پھر وہیں رکھی رہی اور کسی نے اِسے ہاتھ نہیں لگایا۔

چولہے میں لکڑیوں کے چٹخنے کی آوازیں مدھم پڑنے لگیں اور شعلے پست ہونے لگے تو وہ اٹھنے لگی تا کہ آگ بجھنے سے پہلے باہر سے مزید لکڑیاں لا کر چولہے میں جھونک سکے۔ جوتے پہن کر اس نے چارپائی کی پائنتی کے ساتھ کھڑی لاٹھی تھامی اور دروازے کی سمت بڑھنے لگی۔ دروازہ کے ساتھ ہی بجلی کا بورڈ لگا ہوا تھا، اُس نے بٹن دبا کر بلب جلایا جس کی زرد پیلی روشنی کمرے میں پھیل گئی اور اُس کی اپنی آنکھیں تھوڑی دیر کے لیے چندھیا گئیں، دروازہ کھولتے ہی سرد ہوا کے تیز جھونکے نے اس کے گرد لپٹے بوسیدہ کمبل کے چھیدوں میں سے نشتروں کی طرح اس کے جسم پر وار کیا تو وہ کپکپا کر رہ گئی۔ ایک لمحے کے لیے اسے ایسا لگا جیسے اس کے جسم پر کسی نے چھری سے چیرا لگا دیا ہے۔ یخ بستہ ہوا اُسے اپنے چہرے پر زوردار زناٹوں کی صورت محسوس ہو رہی تھی لیکن اس نے اپنی ہمت مجتمع کی اور کمبل کو اور زیادہ سختی سے جسم کے ساتھ بھینچتے ہوئے قدم گھسیٹنے لگی۔ بلب کی ملگجی روشنی میں اُسے برآمدے کے سرے پر ٹہنیوں کا ڈھیر پڑا نظر آیا۔ ڈھیر کے آگے صحن کے پار رات کے گھپ اندھیرے کی حکمرانی تھی جس کے خوفناک سائے میں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے زندگی تمام تر ہنگاموں کو اپنے دامن میں لیے خاموشی کے ساتھ سو گئی ہے۔ وہ لاٹھی ٹیکتے ٹہنیوں کے ڈھیر تک پہنچی تو سردی کی تیز لہروں نے اس کے سارے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں سُن ہونے لگے۔ اس نے جلدی سے چند ٹہنیاں بازوؤں کا حصار دے کر گود میں دبائیں اور تیزی سے لپک کر اندر آ گئی۔ دروازہ بند کرتے ہی اُسے کھانسی کا دورہ پڑا اور وہ کھانستے کھانستے بے سدھ ہو گئی۔ کچھ دیر بعد طبیعت بحال ہوئی تو وہ خود کو بمشکل گھسیٹ کر چولہے تک پہنچی جہاں آگ بجھ چکی تھی اور چند چنگاریاں راکھ میں دبی اپنی باقی رہ جانے والی زندگی کا جشن منا رہی تھیں۔ اس نے پھونک مارنے کی کوشش کی تو سانس حلق میں ہی اٹک گیا۔ کھانسی کے ایک اور دورہ کے بعد اس نے چند ٹہنیاں چولہے میں جھونکیں اور دیا سلائی دکھا کر آگ بھڑکانے کی کوشش کرنے لگی۔ ماچس کی ڈبیا خالی ہو گئی لیکن کسی ٹہنی نے آگ نہ پکڑی۔ وہ مایوس ہو کر چولہے کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور اپنے

سر کو گھٹنوں میں دے کر کمبل کو زیادہ سختی کے ساتھ اپنے جسم کے اردگرد لپیٹ لیا تا کہ ٹھنڈ کی شدت سے بچا جا سکے۔ کمبل کی باریک بُنائی میں سے جھلکتی بلب کی زرد روشنی کو دیکھ کر اُسے خیال آیا کہ یہ کمبل اُس نے ایک گھر سے ننھے عبدل کو سردی سے بچانے کے لیے مانگ کر لایا تھا اور جب اُس نے عبدل کو اس میں لپیٹ کر سلایا تو وہ ساری رات نہایت پُرسکون نیند سویا رہا جو پہلے ہر تھوڑی دیر کے بعد ٹھنڈ لگنے کے باعث جاگ پڑتا تھا۔ عبدل نے ایک بار اُسے بتایا تھا کہ شہر میں سردی سے بچاؤ کے لیے کس قدر موٹے اور خستہ کمبل ہوتے ہیں اور جب گرمیاں ہوتی ہیں تو تیزی سے چلنے والے پنکھے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا پھینکتے ہیں جس سے گرمی نہیں لگتی۔ وہ جب بھی آتا، اُسے شہر کی دلچسپ اور پیاری باتیں بتایا کرتا اور کہا کرتا کہ جب میری آمدن بڑھ گئی اور رہنے کو کوئی گھر وغیرہ مل گیا تب میں تمھیں شہر لے جاؤں گا تا کہ تم یہاں تنہا، لوگوں کی محتاج زندگی گزارنے سے خلاصی پا سکو۔ اِس بات پر وہ عبدل کی پیشانی چوم لیتی اور اس کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے کہتی: ''بیٹا! تم شہر میں دل لگا کر کام کرو، اپنا ٹھکانہ بناؤ اور ہنسی خوشی وہیں رہو، میرے لیے یہی کافی ہے۔ میرا بوڑھا جسم اب بس کچھ عرصے ہی کا مہمان ہے اور میں نہیں چاہتی کہ گاؤں چھوڑ کر کسی اور جگہ جا کر میری روح نکلے۔''

وہ سوچنے لگی، عبدل شروع میں ہر دو چار ماہ بعد اس کی خیریت دریافت کرنے لیے آ جایا کرتا تھا پھر یہ عرصہ بڑھ گیا اور بڑھتے بڑھتے سال پر محیط ہو گیا۔ اس پر بھی وہ معترض نہ ہوتی، اُسے معلوم تھا کہ عبدل ہر دوسرے تیسرے روز چودھری غلام حسین کے گھر فون کر کے ماں کی خیریت کے متعلق دریافت کر لیتا ہے، اور چودھری کے گھر والے اُسے بھی عبدل کے فون کے بارے میں بتا دیتے تھے۔ یہ سن کر وہ بے حد مسرور ہو جاتی، نظریں اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتی گویا شکر ادا کر رہی ہو کہ اس نے عبدل کو شہر بھجوانے کا فیصلہ کر کے بہت اچھا کیا جس نے عبدل کو گاؤں کی سخت محنت اور مشقت اور یہاں کے جھنجھٹ سے دور شہر کی فضاؤں کا پنچھی بنا دیا جہاں وہ ترقی کرتے کرتے ایک دن بڑا آدمی بن جائے گا اور تب لوگ اُس پر فخر کیا کریں گے۔

عبدل اب کی بار پورے سال بعد گاؤں آیا تو اُس نے یہ عذر تراش کر اپنی ماں کو پُرسا دیا کہ شہر میں رہنے کے اخراجات بہت زیادہ ہیں، ہر چیز خریدنے کے لیے کافی سارے پیسے دینا پڑتے ہیں اور جب وہ گاؤں آتا ہے، تو اُس کی جیب پر بہت زیادہ بوجھ پڑ جاتا ہے۔ اور جب چودھری غلام حسین نے ایک دن اُس سے اس شک کا اظہار کیا کہ عبدل نے شہر میں شادی کر لی ہے تو اِس

بات نے اُس کے کلیجے کو اپنی مٹھی میں دبوچ لیا۔ اُسے اپنا وجود لہراتا اور بل کھاتے ہوئے محسوس ہوا جیسے وہ درخت کی سب سے اوپر والی شاخ ہے اور تیز آندھی کے بگولوں نے اُسے اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ غم واندہ کی تیز بارش میں اُسے اپنا جسم بھیگتا ہوا محسوس ہوا اور پوری رات وہ رنج و الم سے بھری روتی رہی، اتنا روئی کہ اُس کی آنکھوں میں پانی ختم ہوگیا اور آنسوؤں کی جگہ اس کے من کی کسک اور تڑپ بہتی رہی لیکن جب عبدل آیا تو اُس نے اس کے سامنے اس بات کا کوئی اظہار نہ کیا۔ کسک اور کرب کو اپنے دل ہی میں دبائے وہ عبدل سے ہنسی خوشی باتیں کرتی رہی اور جب وہ روانہ ہوا تو اس نے صرف اتنا کہا، بیٹا! پچھلا جاڑا میں نے بہت اذیت میں گزارا ہے۔ میرے پاس ایک ہی کمبل ہے جو بوسیدہ ہو چکا ہے اور کئی جگہ سے اس کے تانے بانے ادھڑ چکے ہیں جس میں سے ٹھنڈ بلا دھڑک اندر جسم تک چلی آتی ہے۔ پہلے تو میں جیسے تیسے کر کے اس میں گزارا کر لیتی تھی لیکن اب میرا لاغر اور کمزور جسم اس کمبل میں آنے والی سردیاں گزارنے کے قابل نہیں رہا۔ اگر تم سے ممکن ہو سکا تو کچھ پیسے بچا کر میرے لیے ایک اچھا، موٹی تہہ والا کمبل سردیاں شروع ہونے سے قبل بھیج دینا، ایسا نہ ہو کسی صبح گاؤں والوں کو میرا سکڑا ہوا جسم ملے۔'' عبدل نے قدم باہر کی جانب بڑھاتے بڑھاتے وعدہ کیا کہ وہ راشن کے لیے پیسے بھیجنے کے ساتھ ساتھ کمبل بھی بھیج دے گا اور وہ ایسا سردیاں شروع ہونے سے پہلے ہی کر لے گا۔ تب اُسے یقین ہو چلا کہ عبدل سردیاں شروع ہونے سے پہلے ہی کمبل بھیج دے گا۔

جوں جوں سردیاں قریب آتی گئیں، اس کا یقین بڑھتا گیا اور ہر روز جب وہ صبح اٹھتی تو سوچتی کہ آج اُس کے ہاتھ ایک نرم، خستہ اور موٹی تہہ والے کمبل کا لمس ضرور محسوس کر کے رہیں گے۔ اور جب کافی دن گزر گئے اور جاڑا پھیلنے لگا، تو اُس کی سوچ کا دھارا بدل گیا۔ اب وہ سوچنے لگی کہ کیا پتا عبدل کے پاس کمبل بھیجنے کے لیے اب تک پیسے جمع نہ ہو سکے ہوں، کیا پتا وہ شہر جا کر بھول ہی گیا ہو اور جب کسی رات اُسے خوب ٹھنڈ لگے گی اور وہ اپنے پاؤں کو کمبل کے اندر سکیڑنے کی کوشش کرے گا، تو اُسے ضرور خیال آئے گا کہ اُس کی بوڑھی، ناتواں ماں نے اپنے لیے کمبل مانگ رکھا ہے، اور تب وہ صبح ہوتے ہی اس کے لیے ضرور کمبل بھیج دے گا۔

پیروں کو ٹھنڈ چڑھنے لگی تو اس نے کمبل کا ایک کونہ دونوں پیروں کے نیچے دبا لیا اور سر کو اور زیادہ جھکا کر گھٹنوں میں سکیڑ لیا تاکہ ٹھنڈ سر میں نہ چڑھ جائے۔

''خیر ہے! نیا کمبل نہ ملا تو نہ سہی، آج کی سخت رات بس کسی طرح گزر جائے تو سمجھو

جاڑے کی سختی اور اذیت ختم!'' اُس نے دانتوں کو اور زیادہ مضبوطی کے ساتھ بھینچ لیا اور گھٹنوں کے اردگرد بازوؤں کے حصار کو اور زیادہ سخت کرلیا۔ اُس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ پورے جسم کو ایک دائرے میں سمیٹ لیتی اور اس کے اطراف کمبل کو اس طرح لپیٹ لیتی کہ ٹھنڈ کو اِس میں سے گزرنے کے لیے کوئی درز، کوئی روزن نہ ملتا۔

'' جاڑے کو آج تین ماہ ہوگئے ہیں، تھوڑے دنوں بعد چیت ختم ہوگا تو بیساکھ شروع ہوتے ہی سردی کی شدت اپنے اختتام کو پہنچ جائے گی اور ساتھ ہی اِس کی اذیت بھی۔ پھر وہ حساب کرنے لگی کہ چیت ختم ہونے میں کتنے دن باقی رہ گئے ہیں۔ دن گننے کے لیے اُس نے اپنی انگلیوں کی پوروں کو حرکت دی تو وہ سختی سے گھٹنوں کے ساتھ چپکی ہوئی تھیں۔

'' بیساکھ میں جب کسان کھیتوں میں ہل لگائیں گے تو اوپر آسمان پر گرم سورج چمکتا ہوگا اور عورتیں گھروں سے کھانے کی پراتیں اور لسی کے مٹکے اٹھائے کھیتوں میں لایا کریں گی تو گاؤں کی گلیوں میں زندگی اتر آئے گی اور تب وہ اپنے گھر کے دروازے پر بیٹھ کر آتی جاتی عورتیں سے خوب باتیں کیا کرے گی اور انہیں بتایا کرے گی کہ عبدل نے اُس کے لیے نیا کمبل بھیجا ہے، جس میں اِس بار سردیاں گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔'' وہ آنے والے وقت کے بارے میں سوچتے ہوئے زندگی کی حرارت کو اپنے وجود کے اندر تک محسوس کرنے لگی۔ پھر وہ سوچنے لگی کہ آج کی رات کسی طرح گزر جائے تو کل سورج نکلتے ہی گاؤں میں کسی سے پرانی چادر، ادھڑا ہوا کمبل مانگ کرلے آؤں گی۔ خدا کا کوئی نہ کوئی نیک بندہ مجھے ضرور کمبل دے گا کہ میں نے سب کی خوب خدمت کی ہے۔

اچانک اُسے محسوس ہوا کہ کمبل میں کسی جگہ سے ٹھنڈی ہوا اندر گھستی چلی آرہی ہے جو سوئیوں کی طرح اس کے جسم میں چبھ رہی ہے۔ چبھن دیکھنے کے لیے اس نے اپنی گردن کو حرکت دینا چاہی تو معلوم ہوا کہ وہ گھٹنوں میں کافی دیر سے دبے رہنے کے باعث اکڑ گئی ہے۔ پھر اُس نے اپنے ہاتھ ہلانا چاہے کہ انہیں آگے بڑھا کر کمبل کو اور زیادہ سختی سے اپنے جسم کے ساتھ بھینچ لے تو وہ بھی منجمد ہوجانے کے باعث حرکت کرنے سے معذور رہے اور جب اُس نے اپنے جسم کو حرکت دینا چاہی تو محسوس ہوا کہ ساری ہڈیاں ایک دوسرے کے اندر تک اس طرح پیوست ہوگئی ہیں کہ ان کے ہلنے جلنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ وہ کافی دیر تک اسی طرح اکڑوں بیٹھی رہی۔

رات نصف سے زیادہ بیت چکی تھی لیکن اس کی مظلوم جان کے لیے اس کا قہر کسی صورت ٹلنے یا کم ہونے والا نہیں تھا۔ وہ اسی طرح اپنے غم اور اپنے کرب پر آنسو بہاتی رات کٹنے کا انتظار کرنے لگی۔ آخر صبح کی پہلی روشنی کا ستارہ

نمودار ہوا اور باہر گلی میں کسی خارش زدہ کتے کے بھونکنے کی پھس پھسی سی آواز سنائی دی۔ ''شاید۔۔۔ شاید عبدل آ گیا ہے۔ ہاں ہاں! آخر وہ آ ہی گیا اور اُس کے ہاتھوں میں سفید، نرم وملائم کمبل لٹک رہا ہے۔'' وہ جلدی سے اٹھی اور آگے بڑھ کر عبدل کی پیشانی کے بوسے لینے لگی۔

'' آؤ بیٹا! آؤ۔۔۔ مجھے بڑی شدت سے تمھارے آنے کا انتظار تھا۔ دیکھو! اس دفعہ جاڑا کتنے زور کا پڑا ہے اور آج رات کی ٹھنڈ میں نے زندگی میں کبھی محسوس نہ کی تھی۔ حتیٰ کہ جس رات تم بستر گیلا کر دیتے تھے، تب بھی میں اِس پر بڑے سکون کے ساتھ سوئی رہتی تھی اور مجھے ذرا بھی سردی نہ لگتی تھی۔ اچھا ہوا کہ تم یہ کمبل لے آئے۔ مجھے اس کی ضرورت بہت زیادہ محسوس ہو رہی ہے۔ یہ دیکھو! پہلے والے کمبل کی حالت بہت خراب ہو چکی ہے، اب یہ اوڑھنے کے قابل نہیں رہا۔ میں اِسے چولہے کے پاس لیٹتے ہوئے اپنے نیچے بچھا لیا کروں گی۔''

تب عبدل نے غور سے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور آگے بڑھ کر بوسیدہ کمبل کا ایک کونا اپنے ہاتھ میں لے کر دیکھنے لگا۔

''بیٹا! بہت ٹھنڈ ہے۔ تم جلدی سے یہ کمبل میرے اوپر اوڑھ دو۔ ٹھنڈ نے میری ہڈیوں کا گودہ تک جما دیا ہے۔''

عبدل نے آگے بڑھ کر کمبل ماں کے اوپر اوڑھ دیا جو چولہے کے پاس ہی لیٹی ہوئی تھی اور پھر چولہے میں لکڑیاں ڈال کر آگ سلگانے لگا جو دھیرے دھیرے تیز ہونے لگی اور اس کی تپش جب اُسے اپنے چہرے پر محسوس ہوئی تو ایسا لگنے لگا جیسے اس کے وجود پر جمی برف پگھلنے لگی ہے اور اس کے اندر ٹکڑے بنے خون کے قطرے اب ٹوٹ کر رگوں میں رواں ہونے لگے ہیں جن کی حرارت سے اُسے زندگی کی طمانیت اور راحت محسوس ہونے لگی ہے۔ دھیرے دھیرے زندگی کی یہ حرارت اس قدر بڑھ گئی کہ اُسے اپنا وجود چولہے میں بلند ہوتے شعلوں کا ایک حصہ محسوس ہونے لگا جیسے وہ بھی ایک شعلہ بن گئی ہے اور ان شعلوں کی لپٹیں اس کے سروں سے بھی اوپر کو اٹھنے لگی ہیں۔

سورج کی کرنیں پھیلتے پھیلتے بند دروازے اور کھڑکیوں کی درزوں سے کمرے کے اندر تک سرکنے لگیں اور سرکتے سرکتے اُس کے وجود پر ناچنے لگیں۔ چولہے میں لپکتے شعلے ماند پڑنے لگے اور اس کا اپنا وجود بھی پست ہونے لگا اور پست ہوتے ہوتے چنگاریوں میں تبدیل ہونے لگا۔ کچھ دیر بعد یہ چنگاریاں راکھ بن گئیں اور دوپہر چڑھے جب ایک ہمسائی اندر آئی اور پھر گاؤں کے دوسرے لوگ بھی آئے تو انہوں نے یہ راکھ اٹھا کر گاؤں سے باہر جہاں کھیتوں کا وسیع سلسلہ شروع ہوتا تھا، اس سے منسلک ایک احاطے میں ڈال دی۔

☆☆☆☆☆

ان دنوں

کراچی، سال ۱۱۰۲ ع اس سال جو ماہ رمضان آیا، شہر کی فضا میں عجیب سراسیمگی سی پھیلی ہوئی تھی۔ ہر طرف خوف اور موت کے وحشت ناک سائے منڈلاتے تھے۔ پرندے بھی اپنے مسکن میں سہمے سے رہتے تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا، جو قدم گھر سے باہر نکلا، وہ سلامت واپس آ بھی پائے گا یا نہیں— ٹارگٹ کلنگ کا دور دورہ تھا، کوئی بھی، کسی بھی وقت، کسی اندھی گولی کا نشانہ بن سکتا تھا۔ بوسیدہ اور خستہ حال بوریاں دہشت کی علامت بن چکی تھیں۔ کبھی کسی کوڑے کے ڈھیر سے، تو کبھی خودرو جھاڑیوں کے درمیان، کبھی کسی سنسان سڑک کنارے --- آئے دن تشدد زدہ بوری بند لاشیں برآمد ہوا کرتی تھیں۔ اسی پر وحش فضا میں ماہ مبارک کا چاند، اداسی کی چادر اوڑھے نمودار ہوا۔ لوگ سوگوار ماحول میں رمضان کے مخصوص معمولات میں مشغول ہو گئے۔ صوبائی انتظامیہ نے فیصلہ کیا تھا کہ اس بار عیدالفطر سادگی سے منائی جائے گی۔

مولوی فضل دین محلّہ کی جامع مسجد کے پیش امام تھے۔ مسجد اور مولوی صاحب کے کنبے کے "توسیعی منصوبے" کی وجہ سے انہیں مسجد سے چند گلی فاصلے پر قدرے کشادہ مکان کرایہ پر لینا پڑا۔ وہ لگ بھگ پچاس، پچپن کے پیٹھے میں ہوں گے۔ ملانی صاحبہ کی صحت اوپر تلے سات بچوں کی پیدائش کے بعد اکثر خراب رہنے لگی۔ مگر مولوی صاحب کے "توسیع پسندانہ عزائم" میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ ان سب باتوں سے قطع نظر، مولوی فضل دین نہایت منکسر المزاج اور سادہ طبیعت کے مالک انسان تھے۔ بلاتفریق محلے کے سبھی رہائشی ان کی بہت عزت کرتے تھے۔

وہ بھی ہر ایک کے لیے شفیق و مہربان باپ کی طرح تھے۔ والدین کا تعلق کسی بھی مکتب فکر سے ہو، محلے کے سب بچے قرآن کی تعلیم حاصل کرنے انہی کے پاس آیا کرتے تھے۔ یوں تو یہ علاقہ نسبتاً پرامن تھا۔ سب محلے دار پرانے وقتوں کے ہمسائے تھے۔ یہ محلّہ باہمی رواداری کی مثال تھا لیکن رمضان میں اطراف کے علاقے سے دو تشدد زدہ، بوری بند لاشیں برآمد ہو چکی تھیں۔ جس کے سبب یہاں کے باسیوں کے دلوں میں بھی خوف نے ڈیرے جما لیے تھے۔

خوف کے سائے میں، رمضان المبارک

نیر عامر

رخصت ہوا اور عید کے چاند نے رونمائی کی۔
عید کی صبح، نماز فجر کے بعد مولوی صاحب مسجد کے منتظم سے مخاطب ہوئے، "مزمل صاحب عید کی نماز میں ابھی تھوڑا وقت ہے، میں اتنی دیر ذرا گھر سے ہو آؤں"۔
"جی مولوی صاحب! آٹھ بجے کا اعلان کیا ہے، آپ پونے آٹھ تک پہنچ جایئے گا"۔ منتظم نے تاکید کی۔ لوگ نماز عید کے لیے مسجد میں جمع ہونا شروع ہو گئے لیکن مولوی صاحب کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ آٹھ بج چکے تھے— مزمل صاحب کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ ان کا نمبر بھی بند جا رہا تھا۔ ناچار دو بچوں کو مولوی صاحب کے گھر کی طرف دوڑایا۔ بچے مولوی صاحب کے گھر سے جو خبر لے کر آئے تھے، اسے سن کر تو سب کے پیروں تلے سے زمین ہی نکل گئی۔ بچوں نے بتایا کہ مولوی صاحب نماز پڑھا کر مسجد سے نکلے تو وہ گھر پہنچے ہی نہیں۔
مزمل صاحب نے نماز عید کی امامت محلے کے سفید پوش بزرگ اور مسجد کمیٹی کے سرگرم رکن، حاجی غفور صاحب کے ذمہ لگائی اور بعد از نماز مولوی صاحب کی تلاش کے لیے نکلنے کا فیصلہ کیا گیا۔
تمام اہل محلہ سے پوچھ گچھ کے بعد مزید تشویشناک حقائق سامنے آئے۔ محلے کے کچھ بچوں نے مولوی صاحب کو ایک سفید رنگ کی مشکوک گاڑی میں بیٹھتے ہوئے دیکھا تھا۔
"انکل! ہم لوگ اپنے دوستوں کو جمع کر رہے تھے کہ ہم نے دیکھا سفید رنگ کی گاڑی مولوی صاحب کے نزدیک سے گزری اور ان کے سامنے آ کر رک گئی۔ ایک بندہ باہر نکلا اور مولوی صاحب کو گاڑی میں بٹھا لیا— وہ تین بندے تھے، ایک ڈرائیور کی سیٹ پر اور دو پیچھے مولوی صاحب کے ساتھ "— بچے نے تفصیلات بتائیں۔ "تم نے ان کے چہرے دیکھے تھے؟ اگر دوبارہ دیکھو تو پہچان لو گے...؟" ایک بزرگ نے استفسار کیا۔
"نہیں چاچا ہم کافی دور سے دیکھ رہے تھے — جتنی دیر میں ہم نزدیک پہنچتے مولوی صاحب گاڑی میں بیٹھ کر جا چکے تھے"— بچے نے وضاحت کی۔
اب اس معاملے میں پولیس سے مدد طلب کرنا ناگزیر ہو گیا تھا۔ ملائی صاحبہ کی مدعیت میں ایف - آئی - آر درج ہوئی۔ مولوی صاحب سے کسی کی دشمنی تو تھی نہیں، یقیناً یہ شہر میں پھیلی دہشتگردانہ کارروائیوں میں سے ایک تھی۔
پولیس کی ابتدائی تفتیش میں اسے ٹارگٹڈ اغوا کی واردات قرار دیا گیا۔ اسی تلاش بسیار کے دوران عید کا تیسرا دن آ گیا لیکن مولوی صاحب بازیاب نہ ہو سکے— نہ زندہ، نہ مردہ—!
چوتھے روز جب مزمل صاحب اور دیگر معززین محلہ ان کے گھر خبر گیری کے لیے

آئے ہوئے تھے، اچانک ہی مولوی صاحب زندہ سلامت گھر پہنچ گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے علاقے کے ایس۔ایچ۔او صاحب بھی اندر داخل ہوئے۔ اس سے پہلے کہ مولوی صاحب کچھ کہتے، ایس۔ایچ۔او صاحب ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، معنی خیز انداز میں بولے، "لیجیے! مزمل صاحب! آپ کی امانت"--- "آپ کی بڑی نوازش ہے جناب!" مزمل صاحب نے بھی گرمجوشی کا مظاہرہ کیا۔

"مولوی صاحب کو آپ نے بازیاب کہاں سے کروایا؟ کوئی خطرناک، دہشتگرد گروہ تھا---؟ انہوں نے انہیں کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا---؟" حاجی صاحب نے ایک سانس میں کئی سوال کر ڈالے---

"آپ بتائیں گے مولوی صاحب! یا میں کچھ عرض کروں؟" انسپکٹر کا انداز سبھی کے تجسس کو مہمیز کر رہا تھا۔

"میں خود بتاتا ہوں"--- وہ جھینپ کر بولے اور ایک اچٹتی سی نگاہ اندرونی دروازے کی طرف ڈالی جہاں پردے کے پیچھے ملانی صاحبہ تمام کارروائی سن رہی تھیں--- انہوں نے بات کو آگے بڑھایا، "میں جب مسجد سے نکلا تو گھر کے راستے میں ہی ایک گاڑی نے میرا راستہ روک لیا، میں گھبرایا--- مگر غور سے دیکھنے پر میں نے انہیں پہچان لیا۔ وہ محمود اور ارشد تھے--- ساتھ میں ان کا کوئی دوست تھا جو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا"---

"کون محمود---؟! کون ارشد---؟!" حاجی صاحب کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا۔

"وہ---میرے---سالے---!"

مولوی صاحب کی زبان لڑکھڑائی--- سنبھل کر دوبارہ گویا ہوئے، "میرا مطلب ہے، میری دوسری بیگم کے بھائی---

دو سال پہلے میں نے ایک بیوہ سے نکاح کر لیا تھا--- اس کے پہلے سے دو بچے ہیں، وہ مجھے ہی اپنا باپ سمجھنے لگے ہیں--- اس سے میرا بھی ایک چھ ماہ کا بیٹا ہے۔ میں نے بچوں سے وعدہ کیا تھا کہ اس مرتبہ عید ان کے ساتھ مناؤں گا۔ ارادہ تھا کہ عید کی نماز سے فارغ ہو کر چلا جاؤں گا اور دن ان کے ساتھ گزار کر رات تک واپس آ جاؤں گا۔

مگر بچے اور ان کی ماں بضد تھے کہ میں عید کے تینوں دن ان کے ساتھ گزاروں--- میں نے منع کر دیا کہ اتنے دن تک مسجد سے غیر حاضر نہیں رہ سکتا--- میرے سالوں نے اپنی بہن اور بھانجوں کو دل گرفتہ دیکھا تو عید کی صبح صبح مجھے لینے چلے آئے--- میرا موبائل بیگم کے قبضے میں تھا اس لیے کسی کو اطلاع نہیں دے سکا--- میں بے حد شرمندہ ہوں"---

یہ کہتے ہوئے ان کی نگاہیں اندرونی دروازے کے پردے پر جمی رہ گئیں---

☆☆☆☆☆

اختیار

ہر لڑکی اپنی ذات میں شہزادی ہے اس بات سے قطع نظر کہ اس کا جنم محل میں ہوتا ہے یا جھونپڑے میں-- اس کے بدن پہ قیمتی ملبوس ہے یا پیوند لگا ملبوس دریدہ-- اس کے سر پر ہیروں کا تاج ہے یا گدلی، میلی اوڑھنی-- وہ مہنگی سواری میں سفر کی عادی ہے یا ٹوٹی چپل اسکی مسافتوں کی تھکن بانٹتی ہے--

کچھ ذہنوں میں محبت کی قبروں کا استعارہ تاج محل ہوتا ہے تو کچھ میں خواہشات اور تعیشات کی علامت خوابوں کا محل--

ایک لڑکی دنیا میں آنکھ کھولتے ہی خوابوں کی نقدی جمع کرنے لگتی ہے اس امید پر کہ ایک روز کوئی آئے گا اور بکھری اینٹوں کی مانند بے ترتیب نقدی سمیٹے گا-- انہیں اپنی محبت کے گارے سے جوڑ کر محل کی شکل دے گا-- اور وہ خوابوں کے بنے اس محل میں راج کرے گی--

وہ بھی خوابوں کے سراب میں جیتی ایک عام سی لڑکی تھی-- جس کی زندگی کے شب و روز کو مجروح کرتے حالات کے تھپیڑوں کی ضرب کو اس کی معصوم امیدوں کا نرم ہاتھ تھپتھپاتا-- اور وہ حالات کا ہر ستم ہنس کر جھیل جاتی--

رائیگیر-- دل کا دروازہ کھٹکھٹاتے لیکن وہ کان بند کر لیتی-- اس آس پر کہ "جو اسکا ہوگا اسے دستک کی حاجت نہیں ہوگی-- اس کے لئے دل کا دروازہ اپنے آپ وا ہو جائے گا-"

لیکن ہر دروازے کے مقدر میں چابی ہو-- یہ ضروری نہیں-- کچھ دروازوں پہ پڑے تالے چابی کی آس میں ہی زنگ آلود ہو جاتے ہیں-- اور چابیاں بے اثر ہو جاتی ہیں-- اور جن دروازوں تک درست چابی والے ہاتھ کی رسائی کے امکانات معدوم ہو جاتے ہیں-- ان دروازوں کے پیچھے تنہائی کے آسیب ڈیرا ڈال لیتے ہیں--

اس کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہوا-- دل کے دروازے --- چابی والے ہاتھ کے منتظر رہ گئے-- اور دل حویلی کے جملہ حقوق کسی کے نام لکھ دیئے گئے-- لیکن دل بھلا ان بندشوں کو کب مانتا ہے--

"تمہارا رشتہ تمہارے چچا زاد کے ساتھ طے کر دیا گیا ہے" اپنے تئیں اسے یہ خوش خبری سنائی گئی لیکن سنانے والے کو کیا خبر کہ سماعتوں پہ کیا گزری--

اسے اس کی مرضی کے خلاف ایک اَن

کنزیٰ خالق

چاہے رشتے میں باندھ دیا گیا-- جہاں نہ دل راضی تھا نہ دماغ۔

وہ اپنی ذات میں اپنی خواہشوں سے جنگ لڑتی رہی-- اپنے خوابوں کا گلا گھونٹتی، جانکنی کی اذیت سے گزرتی رہی-- خواب بھی گویا آب حیات پی بیٹھے تھے-- وہ روز زندگی اور موت کی یہ اعصاب شکن جنگ لڑتی-- روز زندگی جیت جاتی اور اسے نڈھال کر جاتی-- ستم بالائے ستم اس جنگ کے محرک کو اس سب کا رتی بھر بھی ادراک نہیں تھا-- اور نہ پرواہ--

زندگی کے تلخ حقائق میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جو پرواہ کرتا ہے، احساس کی چکی میں وہی پستا ہے-- بے پرواہ ان اذیتوں سے آزاد رہتا ہے-- اس کے لئے نہ سانس بھاری ہوتی ہے-- نہ زندگی سزا-- ہاں پرواہ کرنے والا حساس دل ہر روز اپنی موت آپ مرتا ہے اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی--

اس کی اذیتوں کا بھی کوئی گواہ نہ تھا-- اسے نہ گلہ کرنے کا حق تھا نہ سکنے کا-- کہنے کو وہ اکیسویں صدی کی لڑکی تھی لیکن اس کے ہونٹوں پہ احترام اور لحاظ کے قفل لگا دیئے گئے--

وہ جو چاہنے اور چاہے جانے کے خواب دیکھتی تھی--

ایک ایسے رشتے کے زہر سے جس میں نہ چاہت تھے-- نہ چاہے جانے کا غرور-- دنوں میں کملا کر رہ گئی--

اس کی امید کے مرجھاتے پھولوں کو ہر روز دلاسے کے چھینٹے مارے جاتے--

منگنی سے نکاح تک کا سفر اذیتوں کے تپتے صحرا میں پا پیادہ سفر کی ایک طویل داستان تھی--

"تم لڑکی ہو، برداشت کرو"

یہ جملہ ہر سانس کے ساتھ اس کے اندر انڈیلا جاتا--

"تم اپنی محبت سے اسے بدل لوگی"

اور لفظ محبت پہ اسے لگتا کسی نے اس کے منہ پہ تمانچہ دے مارا ہو--

"سب ٹھیک ہو جائے گا"

اور ایک درد بھری کاش ہونٹوں پہ آ کے ہار جاتی۔

یہ اور اس سے ملتے جلتے جملے اس کے معمول کا حصہ تھے--

لڑکیاں فطری طور پر خوش فہم ہوتی ہیں-- جب کوئی راہ فرار نہ بچی تو اپنی رہی سہی سانسوں کی بقا کے لئے اس نے امید کے نخلستاں کی کھوج شروع کر دی-- جب وہ امید کی کوئی کرن تلاش رہی تھی-- ایک روزن کھلا--

اس کے وجود میں پنپنے والے زندگی کی موجودگی کا احساس عرصہ دراز سے ہنسی کو ترسے ہونٹوں کے لئے مسکراہٹ کا جواز بن گیا۔

"شائد اب سب کچھ بدل جائے" امید مسکرائی۔

کہنے کو وہ دن بھی عام سے دنوں کی طرح ہی طلوع ہوا-- سورج نے مشرق سے ہی جھانکا اور رفتہ رفتہ افق پہ سرک آیا-- وسطِ جون کا ایک تپتا ہوا دن--

وہ باہر سے "تھکے ہارے" آئے مجازی خدا کے لئے چائے لائی تھی-- چائے کی پیالی میز پر دھر کر وہ "خوشخبری" سنانے کو الفاظ ترتیب دے رہی تھی--

"آخ تھو۔" ایک گھونٹ پینے کے بعد اس نے طیش میں تھوکا۔۔اور کپ دیوار پر دے مارا۔۔امید کپکپائی۔۔ "یہ چائے لائی ہو؟؟ یا شیرے کا شربت؟؟۔۔ اب اسے ان بے بنیاد اعتراضات پہ حیرت نہیں ہوتی تھی۔۔ پھر بھی ایک نحیف سا اعتراض کیا۔۔ "ایک چمچ چینی ہی ڈالی تھی" وہ منمنائی۔ "دیکھے کی چمچ ڈالی تھی کیا؟؟؟" "حد ہوتی ہے لاپرواہی کی" "میں تنگ آ گیا ہوں اس سب سے۔۔" اس کے بعد گالیوں کا وہ طوفان اٹھا کہ الامان۔۔ لفظوں کی سنگباری سہتی وہ نحیف سی لڑکی سن کھڑی سامنے کھڑے اس کے مجازی خدا کے منہ سے نکلنے والے "تعریفی کلمات" سن رہی تھی۔۔ وہ جو کہنے آئی تھی سب بھول بھال چکی تھی۔۔ آج جانے کیوں معمول کے لفظ زیادہ تکلیف دے رہے تھے۔۔ زخم ادھڑ رہے تھے۔۔ دل کراہ اٹھا۔۔ اور امید منہ چھپانے لگی۔۔

"میں یہ زبردستی کا تعلق مزید نہیں نبھا سکتا" "تم وہ نہیں ہو جس کے ساتھ کی خواہش میں نے کی تھی۔۔ اور کبھی بن بھی نہیں سکتی۔۔" وہ اپنی ذات کو کٹہرے میں کھڑا کیے۔۔ خود سے سوال کر رہی تھی۔

"کیا اس دن کے لئے اس نے اپنے خواب، اپنی ذات، اپنا غرور تیاگ دیا تھا؟" "کیا یہ تھا اس کی ریاضت کا صلہ؟؟" مردانگی کے غرور میں مست۔۔ وہ انسان جانتا تھا کہ وہ صنفِ نازک کو اپنانے اور ٹھکرانے کا حق رکھتا ہے۔۔ کیونکہ وہ مرد ہے.....

سو وہ اپنا آخری حق استعمال کرنے کو مڑا۔۔ "میں تمہیں طلاااا....." وہ انتہائی قدم اٹھانے کو تیار تھا۔۔ جونہی مڑا۔۔ زبان گنگ رہ گئی۔۔ لفظوں کے زخم سہتی۔۔ وہ لڑکی کب کی ڈھے چکی تھی۔۔

"مبارک ہو۔۔ آپ باپ بننے والے ہیں"۔۔ نرس نے آ کر اسے اپنے تئیں خوشخبری سنائی۔۔ اور اسے سمجھ نہیں آئی کہ یہ اس کے لئے خوشی کی خبر تھی۔۔ یا دکھ کی۔۔

اسی کشمکش میں چلتے اس نے جونہی لیڈی ڈاکٹر کے کمرے کا دروازہ کھولنے کی غرض سے ہاتھ رکھا۔۔ اندر سے آتی آواز سن کر ٹھٹھک گیا۔۔

"مجھے یہ بچہ نہیں چاہیے" یہ سرد سپاٹ جملہ یقیناً اس کی بیوی کے لبوں سے ادا ہوا تھا۔۔ "لیکن کیوں؟؟" ڈاکٹر کے لہجے میں حیرت نمایاں تھی۔۔

"اگر بیٹی ہوئی تو وہ میری طرح جھوٹی انا اور عہد کی پاسداری کے نام پر۔۔ جہنم میں جھونک دی جائے گی۔۔ اس سے اسکی ذات کا غرور چھین لیا جائے گا صرف اس لئے کہ وہ لڑکی ہے۔۔ بے اختیار ہے"۔۔

"لڑکا بھی تو ہو سکتا ہے؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔۔ "اگر لڑکا ہوا تو وہ کسی اور کی بیٹی کے ذات کا غرور کو اپنے مردانہ تکبر کے قدموں تلے روند دے گا۔۔ صرف اس لئے کہ وہ لڑکا ہے۔۔ بااختیار ہے"

اب سُن ہونے کی باری۔۔ اس کے مجازی خدا کی تھی۔۔

☆☆☆☆☆

غزل

اَے دَستِ ہُنر، تُو نے فقط لفظ جڑے ہیں
سو پُھول پسِ حرف، تہِ سطر پڑے ہیں

آہنگ پہ بنیاد نہ رکھ شہرِ سخن کی
اے دوست! مرے بول مرے منہ سے بڑے ہیں

اب تک مرے تن میں ہیں ترے قرب کی لپٹیں
اب تک ترے نیزے مرے پہلو میں گڑے ہیں

پھر رات کی دلدل میں سرِ شام دھنسا ہوں
پھر صبح کے رَستے پہ مرے پاؤں پڑے ہیں

کس نے تری آنکھیں، مرے چہرے پہ سجا دیں
کِس نے مرے آنسو تری پلکوں پہ جڑے ہیں

گُھل جائیں گی اک رات ہواؤں میں ہوائیں
کیوں لوگ درِ صبحِ ندامت پہ کھڑے ہیں

پتّوں کا تماشا بھی ہے موسم کا تقاضا
ساون کی جھڑی دیکھ کے پیڑوں سے جھڑے ہیں

ہر رات دیئے رات کے معبد میں جلیں گے
اے دن مرے تارے ترے سورج سے بڑے ہیں

کب تک تری سانسیں مرے پَر نوچ چکیں گی
کب تک ترے پنجے مری سانسوں میں گڑے ہیں

خالد، مرے خالد! مرے ہمدم مرے ساتھی
کوتاہ سُخن ہیں، قد و قامت میں بڑے ہیں

خالد احمد

غزل

جو قصے نازنینوں کے سنانے مجھ کو پڑتے ہیں
فسانے آپ لکھتے ہیں پڑھانے مجھ کو پڑتے ہیں

یہ کالی کالی راتیں ہیں جو گزریں آنکھوں آنکھوں میں
تمھارے ہجر کے صدمے اُٹھانے مجھ کو پڑتے ہیں

گھنے جنگل کی لہروں سے مدھر موسیقیاں اُبھریں
یہ نغمے جب ملیں لب سے تو گانے مجھ کو پڑتے ہیں

خموشی آپ کی مجھ سے ارے دیکھی نہیں جاتی
کہ اب تو بھید الفت کے بتانے مجھ کو پڑتے ہیں

پتے سے دیکھنے والے سمجھ لیتے ہیں مضموں جب
لفافے سرخ سطروں کے چھپانے مجھ کو پڑتے ہیں

تماشے وقت دکھلائے مہینوں اور لمحوں کے
یہ کیسے عمر کے ثاقبؔ زمانے مجھ کو پڑتے ہیں

آصف ثاقب

غزل

ہر جگہ اب اُدھار چلتا ہے
اک یہی کاروبار چلتا ہے

رِند ، شیخ عام پینے والوں کا
میکدے میں ادھار چلتا ہے

دیکھنا ہے کہ پی کے کتنی کہاں
کس کا کتنا خمار چلتا ہے!

اپنا اپنا رسوخ ہے ، دیکھیں
اپنا اپنا ، وقار چلتا ہے!

دیکھنا ہے کہ وقت پڑنے پر
کس کے ہمراہ یار چلتا ہے!

حد کوئی انتظار کی کب ہے؟
عمر بھر انتظار چلتا ہے

ٹوٹتے رہتے ہیں سبھی رشتے
مستقل صرف پیار چلتا ہے

صاحبِ اختیار کا دیکھیں
کس قدر اختیار چلتا ہے

کس مقام اور کیسے موقع پر
کس کا کتنا ادھار چلتا ہے!

لے چلو مجھ کو بھی وہاں کہ جہاں
عشق کا کاروبار چلتا ہے

ساتھ چلتا ہے کوئی پیدل اور
ہو کے کوئی سوار چلتا ہے

معرفت کا بھی ان دنوں روحیؔ
کچھ عجب کاروبار چلتا ہے

روحی کنجاہی

غزل

ڈاکٹر الف۔ دال نسیم کی نذر

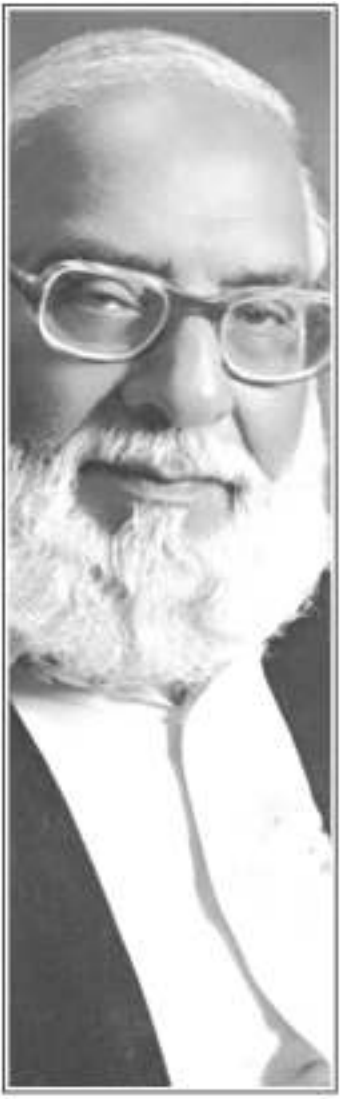

گنبدِ افلاک پر حدِ نظر تک روشنی
پرتوِ خورشید سے پہنچی قمر تک روشنی

ہو گیا بار آفریں چشمِ تلطف سے سماں
برگِ گل شاداب ہے، پھیلی شجر تک روشنی

ظلمتِ شب کے مقابل جاں فشانی شرط ہے
ہے مقدر میں اسی صورت سحر تک روشنی

رفتہ رفتہ طاقچوں کے سب دیے گل ہو گئے
برق رفتاری سے پہنچی ہر نگر تک روشنی

حرمتِ الفاظ سے میری غزل ہے تابناک
دیدۂ پر آب سے سوزِ جگر تک روشنی

سلسلہ ویرانیوں کا روز افزوں ہو گیا
ہے بظاہر مہتمم ہر ایک در تک روشنی

بے سبب ابلاغِ دل افروز میں رخنہ پڑا
دسترس میں گرچہ تھی ہر نامہ بر تک روشنی

ہے ریاضِ دہر میں وہ بھی سکوں نا آشنا
جس کی نادانی سے پہنچی اس ڈگر تک روشنی

سید ریاض حسین زیدی

غزل

افشا ہے آج ، کل کی ہوا کا پتا بھی ہے
دل جس مقام پر ہے قضا کا پتا بھی ہے

ہم اہلِ دل کو دردِ جدائی ہی راس ہے
مائل نہیں ہیں گرچہ دوا کا پتا بھی ہے

رکھتے نہیں ہیں سوچ سمجھ کر اِدھر قدم
اہلِ ہوس کو شوقِ سزا کا پتا بھی ہے

لکھتے نہیں خمارِ تکبر میں خط اُسے
کچھ لوگ جن کے پاس خدا کا پتا بھی ہے

باہر کے رنگ راہ بھلاتے ہیں بار بار
اندر کے آدمی کو سزا کا پتا بھی ہے

اٹھے گا دل تہوں سے جب ابرِ دعا کبھی
بیٹھے گا تب غبار فضا کا ، پتا بھی ہے

چھت کی ہر ایک چیز سنبھالی بہ احتیاط
برسے گی کس دیار گھٹا کا پتا بھی ہے

مرضی کے اشتہار چلا کر ہو مطمئن
تم کو مزاجِ خلقِ خدا کا پتا بھی ہے

عالی نکل پڑے ہو محبت خریدنے
اِس جنسِ کم نشاں کی بہا کا پتا بھی ہے

جلیل عالی

غزل

ایک طرف مینار کو ، ایک طرف گنبد کیا
دو حصوں میں بٹ گئے ، آنگن کو سرحد کیا

عالم فاضل، جہل، کے دیکھے ہم نے فیصلے
مرتد کو مرشد کیا ،مرشد کو مرتد کیا

سولی ، تجھ کو چومنا ، اونچے قد کا کھیل تھا
اس کو عیسیٰ کر دیا اور اس کو سرمد کیا

منصف نام نہاد تھے ، دیکھ نہ پائے ٹھیک سے
کس نے اُٹھا کر ایڑیاں ، اونچا اپنا قد کیا

منزل کھوٹی ہو گئی ، شب کی رونق دیکھ کر
چن لیں سب گمراہیاں ، سب کچھ بے مقصد کیا

ہم نے اپنے کام کے ، اس پر منظر لکھ دیئے
ڈھالا دل قرطاس میں ، اشکوں کو ابجد کیا

اس کا اپنا کھیل تھا ، جو چاہا سو ہو گیا
شہزادہ ، گوتم کیا ، پودے کو برگد کیا

اس کے دل میں کون تھا ، میں تھا یا پھر اور تھا
جان چکا تھا یار کو ، پیار مگر بے حد کیا

کھیل تماشہ تھا کنور ، نام لگا جمہور کے
جس کو چاہا چن لیا ، جس کو چاہا رد کیا

اعجاز کنور راجہ

غزل

یہ ابتدا میں کسی کو بھی کیا خبر ہو گی
کہ جو بھی سعی مسلسل ہے بے ثمر ہو گی

زکاتِ حرف نکالوں کہ مستحق کو ملے
مگر یہ شرم کہ پونجی تو مختصر ہو گی

ہر ایک شخص کے چہرے سے روشنی پھوٹے
اسی امید پہ اب زندگی بسر ہو گی

گھڑی اقامتِ حسنِ عمل کی دور نہیں
وہ یوں کہ منزلِ آخر کبھی تو سر ہو گی

دعا کا معجزہ دنیا میں گر سلامت ہے
مرے چمن کی ہر اک شاخ بارور ہو گی

لہو جلا کے اندھیرے جو کاٹنا چاہے
اسی کے دم سے شبِ غم کی اب سحر ہو گی

جو بات کرنے سے پہلے بھی سوچنا سیکھے
اسی کی بات زمانے میں معتبر ہو گی

میں اپنی ذات کا ناقد بنوں تو بات بنے
پھر احتساب کی صورت بھی کارگر ہو گی

کوئی سبب تو ہے دوری کا میرے آقا سے
قبا میں شیخِ حرم کے بھی تارِ زر ہو گی

ہر ایک رخ سے کئے فصلِ گفتگو لیکن
ہماری بات کا حاصل تو چشمِ تر ہو گی

حسن عسکری کاظمی

غزل

کہکشاں کے نور میں رنگِ بہارِ نغمہ ہے
چاند تاروں کی نگاہوں میں خمارِ نغمہ ہے

سبزہ و گل میں جہاں موجِ بہارِ نغمہ ہے
دشت و صحرا میں بھی اک رنگِ غبارِ نغمہ ہے

ماہ و انجم کا جہاں ہے وادیٔ شعر و سخن
سیلِ رنگ و نور و نکہت، آبشارِ نغمہ ہے

دل فریب و دل نشیں ہے رونقِ شہرِ غزل
رشکِ فردا میں ارم حسن دیارِ نغمہ ہے

کھینچتی ہے میرے دل کو ہر ادا اپنی طرف
عالمِ ہستی میں اک رقصِ نگارِ نغمہ ہے

نغمگی پر ہی تو قائم ہے محبت کی اساس
حسن کی اک ایک ادا موجِ بہارِ نغمہ ہے

ہم ہر اک دکھ کا اسی نسخے سے کرتے ہیں علاج
ہر صدائے درد کو یاں اعتبارِ نغمہ ہے

سوچیے تو یہ بھی اس کا اک بیانِ راز ہے
حسنِ صورت اصل میں نقش و نگارِ نغمہ ہے

ذہن و دل پر ہو رہی ہے بارشِ کیف و سرور
موج میں آیا ہوا ابر بہارِ نغمہ ہے

جوش میں برسات ہے یا نغمگی اُمڈی ہوئی
بجلیاں لرزاں ہیں یا خنداں نگارِ نغمہ ہے

آدمی ہر رنج و غم کو بھول جاتا ہے یہاں
کتنا کیف آور سرودِ جوئے بارِ نغمہ ہے

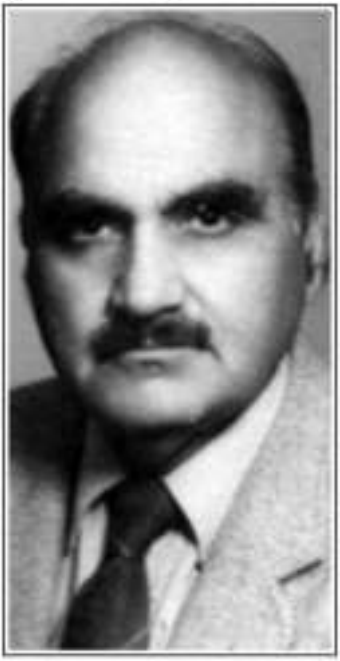

جمیل یوسف

غزلیں

سراب وخواب سے باہر نکلنا چاہتا ہوں
ہوائے دہر تیرے ساتھ چلنا چاہتا ہوں

کوئی تو دھوپ تمازت بھری بھی آئے اِدھر
کہ برف زار ہوں اور میں پگھلنا چاہتا ہوں

ہمیشہ ایک سی حالت میں رہ نہیں سکتا
پھر ایک بار میں گر کر سنبھلنا چاہتا ہوں

قدیم سکّہ ہوں وقعت نہیں رہی کچھ بھی
سو میں بھی آج کے سانچے میں ڈھلنا چاہتا ہوں

خدا کرے کہ وہ گفت وشنید تک آئیں
کہ جتنا زہر ہے مجھ میں اُگلنا چاہتا ہوں

بدل سکا نہیں اُس کو کسی طرح بھی شفیقؔ
سو اَب کی بار میں خود کو بدلنا چاہتا ہوں

شفیق سلیمی

اِس کا ارادہ جان کر اُس کا رویّہ دیکھ کر
تُم نے بھی آنکھیں پھیر لیں خوئے زمانہ دیکھ کر

جتنے گمان تھے مرے سارے یقین ہو گئے
شب میں انوکھا سوچ کر دن میں انوکھا دیکھ کر

وہ جو مرے قریب تھا کتنا لگا عجیب تھا
جانے کہاں وہ کھو گیا رُت کو بدلتا دیکھ کر

کیسی مہیب رات تھی چمکی ذرا سی روشنی
دل کہ دہل دہل گیا اپنا ہی سایہ دیکھ کر

وہ جو تھا ایک سر پھرا ناقہ سوار کیا ہُوا
ریگِ رواں بھی حیرتی خالی کجاوہ دیکھ کر

کارِ دگر نہیں کیا غم سے مفر نہیں کیا
کوئی بہانہ ڈھونڈ کر کوئی خسارہ دیکھ کر

کوئی چراغ بھی نہیں کوئی سراغ بھی نہیں
چاند بھی رُخ بدل گیا میرا ستارہ دیکھ کر

اُس سے شفیقؔ مختصر بین السطور جو کہا
میری سمجھ میں آ گیا بوند میں دجلہ دیکھ کر

غزل

میرے ہونے کا ہر نشان مٹا!
تیر مجھ پر چلا ، کمان ہٹا!

راستے ہو گئے بہت آسان
سر سے جس دن سے سائبان ہٹا

شُکر ہے ، اپنا کچھ خیال آیا!
شُکر ہے اُس طرف سے دھیان ہٹا

اپنی خوشبو بکھیر دے اِس میں
میرے کمرے سے عِطر دان ہٹا

وہ اگر مَیں بھی ہوں تو بڑھ آگے
جو رُکاوٹ ہو، درمیان ہٹا!

غار میں قید رکھ مجھے ، لیکن
رہ میں حائل ہے جو چٹان ، ہٹا

میں نے کچھ صاف صاف کہنا ہے
نعمتوں سے بھرا یہ خوان ہٹا

اتنے پردوں میں بات کیا کرنی؟
یہ جو پردے ہیں، میری مان، ہٹا

بزدلوں کی طرح نہ چھپ اس میں
گر شکاری ہے ، تو مچان ہٹا

میں زمیں کو بھی اوڑھ سکتا ہوں
میرے سر سے یہ آسمان ہٹا!

مجھے کچھ دن مکاں میں رہنے دے
ذہن سے فکرِ لامکان ہٹا

میرے اندر یقین روشن کر
میرے اندر کا ہر گمان ہٹا

پانیوں میں اتار دے مجھ کو
ناؤ کو روک ، بادبان ہٹا

نسیم سحر

غزل

آدھ سے اک، اک سے ڈیڑھ اور ڈیڑھ سے ڈھائی ہوئی
جوش پر کافر مسلمانی ہے اُف آئی ہوئی

ساز کی آواز سن کر کان ڈھانپے بھاگ اُٹھے
دم گھٹا دے سے جب جب سانس شہنائی ہوئی

نوجوانی میں انا پر بوجھ تھا سالوں کا کم
تھی ہمالہ دب کے نیچے برف کے رائی ہوئی

یوں تو ہے ہر چیز وافر اپنے پاکستان میں
جب ہوا سستا روپیہ اور مہنگائی ہوئی

ہے خبر سچی معیشت میں گراوٹ کی دریغ
اُٹھ نہ پائے ہر کسی کی ٹھوکریں کھائی ہوئی

دیکھ کر کس کا خرام آندھی کو بھی آیا ہے رشک
کس کے کوچے سے ہے ہو آئی کہ پُروائی ہوئی

فصلِ گل فصلِ جنوں ہے اور گریبانوں کے ڈھیر
لیر باقی جو گلے میں رہ گئی ٹائی ہوئی

گائے، گائے جا رہی ہے راگ ایمن میں جو چیز
تان سینوں کی ہے سو سو بار کی گائی ہوئی

آؤ، جاؤ جا کے لے آؤ کبابی سے کباب
بادہ برسانے لگی ہیں بدلیاں چھائی ہوئی

سچ مرا سب کا نہیں سچ شور تو جانا ہے سچ
جس قدر شہرت ہوئی اتنی ہی رسوائی ہوئی

بس بس اے ہمزاد من پڑھ فلسفہ شاعر نہ بن
یہ غزل میری ہے لے تیری اب اے بھائی ہوئی

محمد ارشاد

غزل

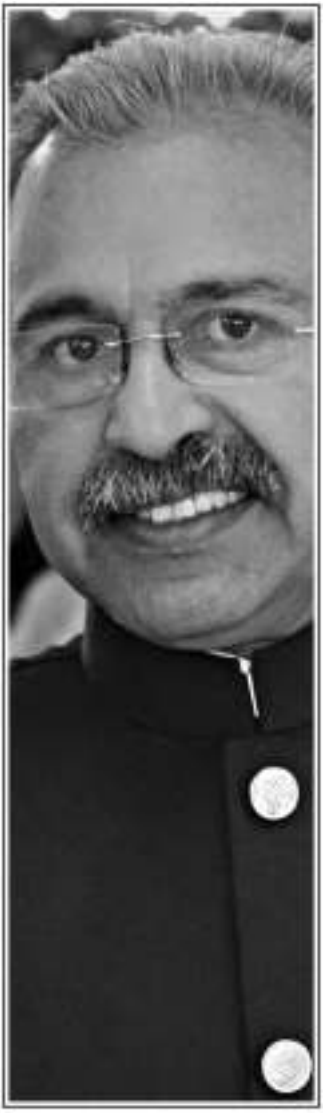

دیے جلانے کا مجھ کو دیا گیا یہ صلہ
کہ صبح آئی تو نام و نشان تک نہ ملا

وہ زخم دیکھ اُڑا دی ہیں دھجیاں جس نے
لباسِ خستہ کا کیا ہے سلا سلا نہ سلا

تو بے نیازی سمجھ لے اسے کہ مایوسی
کسی سے کوئی توقع ہے اب مجھے نہ گلہ

شجر کو صحن میں چپ چاپ کھا گئی دیمک
نہ شاخِ زرد کراہی نہ برگ سبز ہلا

کہیں تو ہو گی ترے لاعلاج غم کی دوا
کبھی تو آئے گا آخر تجھے قرار دلا

رہیں گی یاد کہاں اِن کو نیکیاں تیری
تو چاہے سانپوں کو ہاتھوں سے اپنے دودھ پلا

لہو ٹپکتا ہے تحریر سے تری راحتؔ
کہ لفظ لفظ میں جیسے ہو سرخ پھول کھلا

راحت سرحدی

غزل

ابھی تو ادھورا ہے کارِ تمنا، مگر میں بکھرنے لگا ہوں
کہ خواہش کے بالائی کمرے سے ہجراں کا زینہ اُترنے لگا ہوں

مجھے ایسا لگتا ہے اب کے اڑن طشتری رہنمائی کرے گی!
کہ میں مشورہ پانچویں سمت جاتی ہواؤں سے کرنے لگا ہوں

اسی بات پر آئنے نے بھی مجھ سے مرا حال پوچھا نہیں ہے
کہ اب کے میں ہمزاد پر بے وفائی کا الزام دھرنے لگا ہوں

مہاجر پرندے ابھی تک مری شاخِ جاں پر پلٹ کر نہ آئے
تو پھر کس لیے میں بہاروں کی آمد پہ اتنا سنورنے لگا ہوں؟

اگرچہ حسنؔ میرے صحنِ طلب میں جدائی بھی ماتم کناں تھی
مگر ایسا لگتا ہے اس بار خود اپنی فرقت میں مرنے لگا ہوں

حسن عباس رضا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

باندھا گیا ہے جسم کے پتھر سے کیوں مجھے
نفرت ہے آپ اپنے ہی پیکر سے کیوں مجھے

غزل

چاک پیہم گھما رہا ہوں میں
نقش بگڑے بنا رہا ہوں میں

مر کے جینا ہی اصل جینا ہے
رازِ ہستی بتا رہا ہوں میں

مل نہ پایا صلہ وفاؤں کا
خونِ حسرت بہا رہا ہوں میں

خونِ مظلوم کے ہی چھینٹے ہیں
جن سے دامن بچا رہا ہوں میں

وقت کی نبض رُک گئی جن سے
ایسے منظر دکھا رہا ہوں میں

آفریںؔ کشتِ فن رہے شاداب
جس میں گلشن کھلا رہا ہوں میں

عالمِ بے حسی ذرا دیکھو!
کیوں یہ پردے اُٹھا رہا ہوں میں

اُنسِ باہم ہی درسِ ملت ہے
جو ہر اک کو پڑھا رہا ہوں میں

آدمیت ہے جاں بلب ہر جا
اپنی خفت چھپا رہا ہوں میں

خوابِ خرگوش میں حمیت ہے
سوئے جذبے جگا رہا ہوں میں

کوئی دیپک نہ جل سکا مجھ سے
ہر دیے کو ہوا رہا ہوں میں

رشید آفرین

غزل

جو دل میں ہے وہ زباں سے نکال دیتے ہیں
کہاں کا دکھ ہے کہاں سے نکال دیتے ہیں

وہ آنکھ زخم کو اب مندمل نہیں کرتی
اسے بھی چارہ گراں سے نکال دیتے ہیں

اڑان بھر کے پرندے پلٹ کے آتے نہیں
انہیں پیامبراں سے نکال دیتے ہیں

یقیں کے ساتھ نہ اتریں جو خواب آنکھوں میں
ہم اپنی چشمِ گماں سے نکال دیتے ہیں

جو لوگ ڈوب کے دریا کو پار کر نہ سکیں
انہیں ہم آبِ رواں سے نکال دیتے ہیں

صفدر صدیق رضی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پانی اُتر گیا ، مگر آنکھیں بجھا گیا
سیلِ جمال اپنا نشاں تک مٹا گیا

غزل

سامنے آیا تھا پہلے خواب میں چہرا ترا
پھر نظر آنے لگا مہتاب میں چہرا ترا

ہم کہاں جاتے اگر ملتا نہ چشمے کی طرح
زندگی کے قریۂ بے آب میں چہرا ترا

سرو کا طالع ترے قد کے سبب ہے اوج پر
رنگ بھرتا ہے گلِ شاداب میں چہرا ترا

اپنے اپنے آئنے میں سب نے دیکھا ہے تجھے
ہے نیا اظہار کے ہر باب میں چہرا ترا

ہم بھی کہتے تھے کہ پانی میں دیا جلتا نہیں
منعکس دیکھا نہ تھا تالاب میں چہرا ترا

فکرمندی کی یہ لہریں کیوں تری آنکھوں میں ہیں
آج کل ہے کون سے گرداب میں چہرا ترا

گم نہ کر گلزارؔ اپنے آپ کو ماحول میں
کھو نہ دے پہچان ہی احباب میں چہرا ترا

گلزار بخاری

غزل

جو بستر پر تھکن رکھی ہوئی ہے
کوئی یادِ بدن رکھی ہوئی ہے

مہکتی ہے ہمارے دل کی مٹی
کہیں یادِ چمن رکھی ہوئی ہے

شہیدوں کی لحد ، باغِ ارم ہے
کہ خوشبوئے وطن رکھی ہوئی ہے

ہے جس کوچے میں تیرا آنا جانا
وہیں خاکِ بدن رکھی ہوئی ہے

محبت کی یہ پتھریلی زمیں بھی
بہ یادِ کوہ کن رکھی ہوئی ہے

مری غزلوں کی رنگینی میں اَب بھی
تری دادِ سخن رکھی ہوئی ہے

لبوں کی مسکراہٹ ہے دکھاوا
دلوں میں تو جلن رکھی ہوئی ہے

محبت آپ کی دل میں ہمارے
سدا شاہِ زمن رکھی ہوئی ہے

نمو ہے درد کا ان کی زباں پر
جو کانٹوں پہ چبھن رکھی ہوئی ہے

عقیلؔ اس مُفلسی کے دور میں بھی
متاعِ فکر و فن رکھی ہوئی ہے

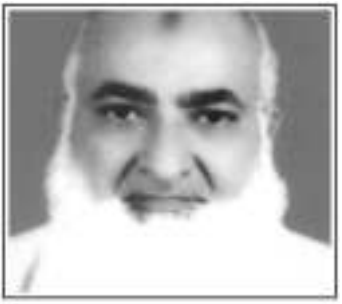

عقیل رحمانی

غزل

نفرتوں کی جو امیں ہو ایسی سرحد مسترد
ہو زباں بے مہر تو پھر اس کی ابجد مسترد

تیری ساری اہلیت ہے قابلِ صد افتخار
فخر تیرا بابتِ آں جدِ امجد مسترد

اس طرح کے سارے جذبے دشمنِ جاں ہی تو ہیں
دل میں پلتے اور پھلتے کینہ و کد مسترد

یہ گھنا سایہ جڑی یادیں غنیمت ہیں مگر
جو ہو تازہ کونپلوں سے عاری برگد مسترد

جو دلوں کو توڑنے کے کام میں مشغول ہیں
سنگِ مرمر سے بنے سب ایسے معبد مسترد

مختلف افراد کی برداشت بھی ہے مختلف
یعنی سب کی ایک حد ہے اس سے زاید مسترد

یہ بنا دے سہل انگاری کا نا عادی مجھے
اس لیے میرے مکرم لطفِ بے حد مسترد

جو بھی ہوں ثاقبؔ غریبوں کے لہو پر استوار
ایسے ایواں ایسی شوکت ایسی مسند مسترد

منظور ثاقب

غزل

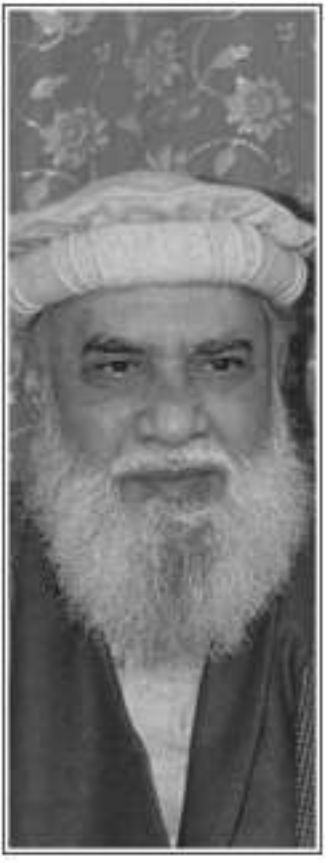

اکرم ناصر

کبھی کہیں تو کبھی ہم کہیں ہیں، بندہ نواز
فقیر لوگ ہیں، رکتے نہیں ہیں، بندہ نواز

ہر ایک چیز کا ہوتا ہے کاروبار یہاں
یہاں پہ شعر ہی بکتے نہیں ہیں، بندہ نواز

جہاں سے تو نے جدا راستے کیے تھے، کبھی
اب آ کے دیکھ لے، ہم تو وہیں ہیں، بندہ نواز

سنا ہے گاؤں میں اب تک بھی کچھ نہیں بدلا
سنا ہے سارے حوالے وہیں ہیں، بندہ نواز

بس ایک تم ہو، کہ جانے کہاں ہو، ورنہ تو
وہ سارے یار پرانے یہیں ہیں، بندہ نواز

ہر اک سے دھوکہ، دغا، دھاندلی، فریب، فراڈ
یہ سارے کام ہی اپنے نہیں ہیں، بندہ نواز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اک شجر کے کوئی دو پتے بھی اک جیسے نہ تھے
میری دنیا میں کسی شے کا کوئی ثانی نہیں

غزل

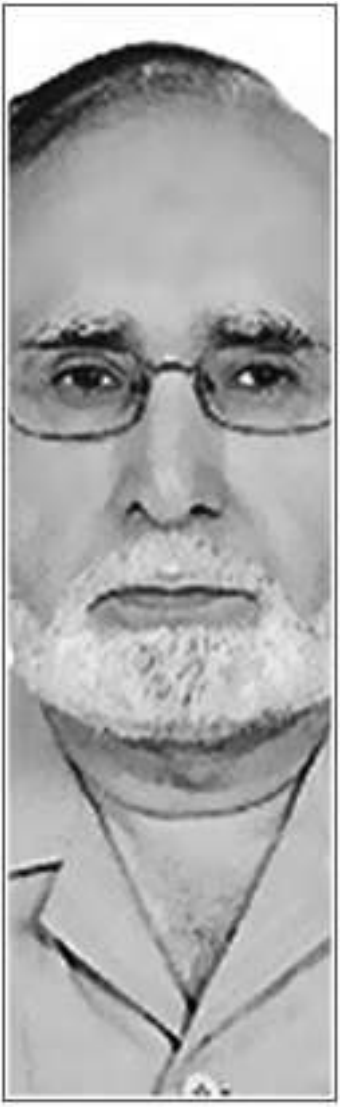

ضدین کا گر باہم اِدغام نہیں ہوتا
دنیا کے جھمیلوں کا ہنگام نہیں ہوتا

باتوں میں اگر تیری اِبہام نہیں ہوتا
پھر ایسا کہانی کا انجام نہیں ہوتا

چہرہ ہی بتاتا ہے موسم ترے اندر کا
ورنہ تو مجھے کوئی اِلہام نہیں ہوتا

کرتے ہو عطا مجھ کو اکثر جو سخی بن کر
آلام تو ہوتے ہیں، اِکرام نہیں ہوتا

ایسا تو کبھی کوئی آیا ہی نہیں لمحہ
جب دل میں قیامت سا کہرام نہیں ہوتا

تسبیح جو ہاتھوں میں اوروں کی طرح ہوتی
چُھپ چُھپ کے گنہ کرتا، بدنام نہیں ہوتا

ہستی یہ ضیاؔ تیری بے کیف بہت ہوتی
گر تجھ پہ محبت کا اِلزام نہیں ہوتا

سید ضیا حسین

غزل

مٹے جاتے ہیں اب آثار اپنے
اُجڑنے کو ہیں سب دربار اپنے

نئی سرکار میں ویراں ہوئے ہیں
کبھی بھرپور تھے بازار اپنے

لٹیروں کو نہ اِتنی چھوٹ ملتی
اگر بکتے نہ چوکیدار اپنے

کئی ہفتوں سے منڈی میں ہے مندی
کہاں لے جائیں اب انبار اپنے

کبھی سوچا نہ تھا قسمت کے ہاتھوں
بکھر جائیں گے یوں انوار اپنے

کسی نے آنچ تک پائی نہ اِن کی
ہوئے ہیں راکھ یوں انگار اپنے

مداوا کر سکے راشدؔ نہ دل کا
سبھی حیلے رہے بیکار اپنے

ممتاز راشد لاہوری

غزل

کشتیِ کا بادباں نہ تھا ازخود اُلٹ گئی
اُڑتی پتنگ ڈور سے اُلجھی تو کٹ گئی

اُس قوم کا نشاں نہیں رہتا، مرے حضور
مرکز سے جو جُدا ہوئی فرقوں میں بٹ گئی

واعظ کا ہے کمال کہ اُمّت رسُول کی
پگڈنڈیوں میں پھنس گئی رستے سے ہٹ گئی

چاندی کی قدر بڑھ گئی بازارِ عشق میں
دشتِ جنُوں میں آبلہ پائی بھی گھٹ گئی

وعدے بہت ہوئے مگر ایفا نہیں ہوئے
اُٹھی تھی آج جو گھٹا بن بَرسے چھٹ گئی

دستِ قبا پہ خونِ شہیداں کا دوش تھا
ارشدؔ کو جب نسیم نے دیکھا پلٹ گئی

ایم ارشد ارشد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پانی اتر گیا، مگر آنکھیں بجھا گیا
سیلِ جمال اپنا نشاں تک مٹا گیا

غزل

جلا ہے آتشِ امکان سے چراغ نیا
منور ہو گیا وجدان سے چراغ نیا

صفا کی اور سے مہکی صدا کا نور چلا
ہوا ہے طور کے پیمان سے چراغ نیا

یہ کس نے سامنے رکھا ہے چاند سورج کے
ابد کے ریتلے میدان سے چراغ نیا

سکوتِ وحشتِ صامت میں یہ گمان ہوا
صدا ہے ڈھونڈتی جی جان سے چراغ نیا

شرابِ نغمۂ سرمستی شعور چڑھی
جو لپکا شعلۂ نروان سے چراغ نیا

ابھر کے آیا ہے اک آفتاب کا ہم سر
ملا ہے وادیٔ مہران سے چراغ نیا

یہ انتقام ہے تیرہ نظام دنیا سے
نکل کے آیا ہے زندان سے چراغ نیا

نظر کی آنچ سے پگھلا گیا علی اصغر
ہوا ہے دیدۂ حیران سے چراغ نیا

علی اصغر عباس

غزل

ہماری آنکھ میں برسات چھوڑ جاتا ہے
یہ ہجر اپنی علامات چھوڑ جاتا ہے

یہ دن کا ساتھ بھی بالکل تمھارے جیسا ہے
کہ روز جاتے ہوئے رات چھوڑ جاتا ہے

میں اس سے شعر بناتا ہوں کیا خبر تجھ کو
تُو بات بات میں جو بات چھوڑ جاتا ہے

پھر آن لیتا ہے مجھ کو یہ آگہی کا عذاب
ترا خیال بھی جب ساتھ چھوڑ جاتا ہے

برا ہے سعدؔ خزاں میں ہوا کا جھونکا بس
کہ وہ بس اڑتے ہوئے پات چھوڑ جاتا ہے

سعد اللہ شاہ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سادہ کاغذ بانٹ رہے ہیں
حرف پہ اترا نجات کا سایا

غزل

میری آنکھوں میں ان آنکھوں کی خماری رہے گی
ایک بے نام محبت ہے جو جاری رہے گی

اُس نے جو کچھ بھی کہا ہے وہ اگر جھوٹ بھی ہو
خوش گمانی مرے احساس پہ طاری رہے گی

کیا تراشے ہیں خدوخال تخیل نے مرے
کیا عجب دل میں وہی راجکماری رہے گی

کیا غضب ہے کہ مری جان کی دشمن ٹھہری
ایک عورت کہ مجھے جان سے پیاری رہے گی

میری وارفتگی دیکھی تو ۔۔۔ ہنس کر بولا
یہ محبت ہے تو پھر عقل سے عاری رہے گی

یہ نچاتی ہے مجھے ریچھ کی صورت ہر دم
زندگی ایک مداری ہے مداری رہے گی

سعدؔ لگتا ہے کہ ہم رات کو جاگا کریں گے
گفتگو چاندستاروں سے ہماری رہے گی

سعد اللہ شاہ

غزلیں

لے کر طلسمِ درہم و دینار آ گیا
میری گلی میں مصر کا بازار آ گیا

ساقی نے شکل دیکھ کے دے دی بقدرِ ظرف
جیسا بھی شیشہ تھام کے مے خوار آ گیا

دیوار لڑکھڑا کے گری اپنے پاؤں پر
مشکل میں آج سایۂ دیوار آ گیا

پوچھا کہ گھر میں سنسنی پھیلی ہوئی ہے کیوں
اُس نے کہا کہ شام کا اخبار آ گیا

راہِ سخن اُسی کے موافق دکھائی دی
خاورؔ جسے سلیقۂ اظہار آ گیا

خاور اعجاز

موت آتی ہے نہ اے زندگی تُو آتی ہے
شہر میں چاروں طرف خون کی بو آتی ہے

ناصحا! سیکھ لے اندازِ محبت ہم سے
سینہ چاکوں کو یہ ترکیبِ رفو آتی ہے

محفلِ ہست کے انوار میں رہنے والو
کیا تمہیں یاد ہماری بھی کبھو آتی ہے

سرد پڑ جاتی ہے جب نارسا سینے میں
تب کہیں جا کے یہ برداشت کی خُو آتی ہے

منہ چھپا لیتی ہیں لہریں سرِ ساحل خاورؔ
ریگِ صحرا جو کسی دن لبِ جو آتی ہے

غزل

فضا میں، کرگس کی ہی سہی، پر۔۔صدا تو ہے نا
بلا کی چپ میں کہیں کوئی ، بولتا تو ہے نا

چلو! قرنطینہ ہی سہی خوش گمانیوں کا
خرابۂ دل مرا۔۔ کسی کام کا تو ہے نا

پلٹ بھی آتے ہیں موت کے منہ میں جانے والے
میں لوٹ آؤں گا کچھ دنوں میں، کہا تو ہے نا

بھلے بزرگوں میں عاشقی کی وبا نہ پھیلے
یہ نوجوانوں کے حق میں اک ابتلا تو ہے نا

جنہیں دوا سے شفا ملے گی، تم ان کا سوچو
ہمیں دعا و درود کا آسرا ، تو ہے نا

سنا ہے نوٹوں میں تولی جائیں گی اپنی لاشیں!!
سو اپنے مرنے کا شہر کو فائدہ تو ہے نا

چلو محبت پہ بعد میں گفتگو کریں گے
ترے مرے درمیان یہ مسئلہ، تو ہے ناں

کبیرؔ یاروں سے خوف کھانے لگا ہوں میں بھی
یہ میرے حق میں برا نہیں ، پر ، بُرا تو ہے نا

کبیر اطہر

غزل

یادیں کسی کی سینے میں اکثر لیے ہوئے
پھرتا ہے کوئی ہاتھ میں، ساغر لیے ہوئے

شیشہ مزاج لوگوں کا بچنا محال ہے
ہاتھوں میں اک ہجوم ہے پتھر لیے ہوئے

آنکھوں میں اس کی ڈوب کے نکلا نہ پھر کوئی
آنکھیں تھیں اس کی، جیسے سمندر لیے ہوئے

تاریکیوں میں چھوڑ گیا ہے وہ ایک شخص
چہرہ، مثالِ ماہ منور لیے ہوئے

دنیا سے جی لگائیں کیا؟ خانہ بدوش لوگ
سب اپنے اپنے کندھوں پہ ہیں گھر لیے ہوئے

شوکتؔ! انھیں گنوا کے جیے جا رہے ہیں ہم
بارِ حیات آج بھی، سر پر لیے ہوئے

شوکت محمود شوکت

غزل

احمد جلیل

نقشِ خوں سے، صلیب سے پوچھا
جرم اپنا نصیب سے پوچھا

شہر بھر میں منافقت کی ہوا
کیوں چلی ہے خطیب سے پوچھا

ہے یہ کیسا ہجوم تیرہ شبی
روشنی کے نقیب سے پوچھا

زخمِ دل کا علاج جا جا کر
ہم نے ہر ہر طبیب سے پوچھا

کیا خبر آج کس لیے اُس نے
حالِ دل مجھ غریب سے پوچھا

کیسے ڈھالیں وہ حسن لفظوں میں
ہر سخنور ادیب سے پوچھا

دوریوں کا سبب جلیلؔ اُس سے
ہم نے جاکر قریب سے پوچھا

غزل

کس طرح دل نے کٹھن وقت گزارا ہو گا
ہار کے جیتا کوئی جیت کے ہارا ہو گا

کیا خبر تھی جو بہار آئی بچھڑ جائیں گے
ہوں گے ہم تنہا یہ دریا کا کنارا ہو گا

دل شکستہ تھا بہت اُس نے خریدا ہی نہیں
وہ سمجھتا تھا اُسے ایسے خسارا ہو گا

پنہاں خوشیاں ہوں ہنسی میں یہ ضروری تو نہیں
شورِ غم قہقہے نے اور اُبھارا ہو گا

ہے یہ دنیا یہاں ہر طرح کے ہیں لوگ مگر
جس کو دیکھو گے وہی درد کا مارا ہو گا

شکر ہے یاد ہماری بھی تمہیں آ ہی گئی
ہم تو سمجھے تھے نہ اب ربط دوبارا ہو گا

کٹ گئی ہے اسی اُمید پہ دو روزہ حیات
جلوہ گر اپنی بھی قسمت کا ستارا ہو گا

میں تو موجود نہ تھا ہجر کے لمحوں میں مگر
ڈوبتے وقت مجھے اُس نے پکارا ہو گا

آخر اک روز سرِ بزم گزرتے پل نے
اُس کے چہرے پہ لگا غازہ اُتارا ہو گا

کس طرح اب کریں ہم اُس پہ بھروسہ طاہرؔ
جو خود اپنا نہیں کیسے وہ ہمارا ہو گا

طاہر ناصر علی

غزل

رخشندہ نوید

اشک پیتے ہوئے حد درجہ حسیں لگتی ہوں
مسکرانے کے سبب خندہ جبیں لگتی ہوں

کیسے ممکن ہے سرِ شاخ اُگوں ازسرِ نو
میں کوئی بیج ہوں کیا زیرِ زمیں لگتی ہوں

روز ملتے ہیں سرِ راہ گداگر جنہیں میں
کسی خوش باش علاقے کی مکیں لگتی ہوں

ٹوٹنا دل کا اسی ضرب سے ہو گا منسوب
خود سے ٹکرا کے ہر اک بار وہیں لگتی ہوں

خالی کمرے میں کہاں ہوتی ہے چھپنے کی جگہ
نقشِ دیوار کی صورت ہی کہیں لگتی ہوں

کیوں مجھے چھوڑ کے جانے کو ہوئی ہے بیتاب
زندگی کیا میں تجھے اچھی نہیں لگتی ہوں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

مجھ پر نہ ہنس مرا قد معیار دیکھ کر
مجھ سے بلند ہے ، مرا معیار دوستی

غزل

شہرِ لاہور کے گلی کوچے
پھر کے دیکھے ہیں ریشمی کوچے

دھند میں ڈوبتا ہوا سورج
کپکپاتے ہیں شبنمی کوچے

شام کے پھیلتے ہوئے سائے
اور یاروں سے ہیں تہی کوچے

اپنی آوارگی کی زد میں ہیں
شہر ، بازار ، آدمی ، کوچے

بے مزہ چائے ، ناشتا ٹھنڈا
صبحِ تنہائی ، بے دلی ، کوچے

کھینچ لائے ہیں اپنی صحبت میں
کچھ نئے خواب ، شاعری ، کوچے

معتکف ہیں جو جانتے ہی نہیں
بانٹتے ہیں جو آگہی کوچے

آشنا صورتوں سے روشن تھے
ملگجے بام ، سرمئی کوچے

ہم نے خود منتخب کیے اصغؔر
اجنبی لوگ ، اجنبی کوچے

اصغر علی بلوچ

غزلیں

ایک بیزاری ہے بے سوز پریشانی ہے
تو گیا ہے تو شب و روز پریشانی ہے

ایک بے چینی سی رہتی ہے رگوں کے اندر
یہ محبت ہے کہ جاں دوز پریشانی ہے

زمزمہ یاد نہیں کوئی نشاطِ گل کا
فکر امروز ہے دیروز پریشانی ہے

دل ترے غم میں سنبھلنے نہیں پایا اب تک
مستقل ہجر ہے ہر روز پریشانی ہے

ایک اندوہِ مسلسل میں سلگتا ہوں شفیقؔ
کوئی فردا ہے نہ امروز پریشانی ہے

شفیق احمد خان

بزمِ گم گشتہ کا سراغ ہوں میں
ایک ٹوٹا ہوا ایاغ ہوں میں

ہر طرف وحشتوں کے ڈیرے ہیں
کوئی اُجڑا ہوا سا باغ ہوں میں

اور کچھ دیر روشنی ہے یہاں
ایک بجھتا ہوا چراغ ہوں میں

افراتفری میں ڈھونڈتا ہے کوئی
گم شدہ لمحۂ فراغ ہوں میں

نقشِ موہومِ عہدِ رفتہ ہوں
ثبت ایام دل پہ داغ ہوں میں

اک تذبذب میں روز و شب ہیں شفیقؔ
ایک بکھرا ہوا دماغ ہوں میں

غزل

حسنین سحر

چھاتا گیا ہر سُو ترا غم آپ ہی
ہے سرنگوں اِس صبح پرچم آپ ہی

یہ سچ نہیں روتے رہے ہم رات بھر
آنکھوں تلک آتا رہا نم آپ ہی

ہم جُرعہ جُرعہ جام سے پیتے رہے
ہوتا رہا ضم خون میں سَم آپ ہی

یہ رات کٹ جائے کہیں کاٹے بغیر
یہ لو کہیں پڑ جائے مدھم آپ ہی

اِس سوچ میں گم بسترِ گل پر گرے
ارض و سما ہو جائیں باہم آپ ہی

کی جستجو تیرے بیانِ حسن کی
اور روح تک کھلتے گئے ہم آپ ہی

آسانیاں دنیا میں دِیں والی نہیں
ہوتے ہیں اِس کے کام کم کم آپ ہی

ہے اِتمامِ آرزو شاید گناہ
تو کھینچ لیجے آخری دم آپ ہی

غزل

میں سیکھتا رہا اِک عمر ہاؤ ہو کرنا
یونہی نہیں مجھے آیا یہ گفتگو کرنا

ابھی طلب نے جھمیلوں میں ڈال رکھا ہے
ابھی تو سیکھنا ہے تیری آرزو کرنا

ہمی چراغوں سے ڈر کر یہ رات بیت گئی
ہمارا ذکر دمِ صبح گو بہ گو کرنا

بھلا یہ کس نے کہا تھا حیات بخش ہے عشق
کبھی ملے تو اُسے میرے روبرو کرنا

کسے خبر کسے ملتا ہے لمسِ فکرِ رسا
خیالِ یار کے ذمے ہے جستجو کرنا

مجھے بھی رنج ہے مرجھا گئے وہ پھول سے لوگ
بتا رہا ہے مرا ذکرِ رنگ و بُو کرنا

کوئی ملے کوئی بچھڑے مجھے نہیں پرواہ
کہ میں نے سیکھ لیا فاصلے رفو کرنا

اشفاق ناصر

غزل

تیری گلی کو شہر کو ایسا بناؤں گا
جنت کا میں زمین پہ نقشہ بناؤں گا

ہوتی ہیں کیسے بارشیں یہ دیکھنے کو بس
محفل میں اب کے آپ کو شیشہ بناؤں گا

توحید کے عمل میں جو کامل میں ہو گیا
پتھر کے دل میں دیکھنا کعبہ بناؤں گا

ثابت کروں گا دعویٰ میں جھوٹا رقیب کا
جو کچھ بنایا اَب کے اکیلا بناؤں گا

سانسیں مرے جنون کی ٹوٹی نہیں اگر
میں آسماں پہ اپنا حوالہ بناؤں گا

زم زم پلائیں گے مجھے آقائے دو جہاں
پیاسوں کے واسطے جو میں چشمہ بناؤں گا

جس میں مقیم کوئی نہ میرے سوا رہے
شاہدؔ میں اُس کے دل میں وہ کمرہ بناؤں گا

ہمایوں پرویز شاہد

غزلیں

پوچھتا کب ہے وہ کس کو کس نگر پیدا کرے
اس کی مرضی ہے جسے چاہے جدھر پیدا کرے

بادشاہت جس کی قسمت میں ہو ملتی ہے اسے
چاہے وہ اُس کو غلاموں ہی کے گھر پیدا کرے

فاش کر سکتا ہوں میں بھی راز اس کے عرش کا
کاش وہ مجھ کو کبھی بار دگر پیدا کرے

کون سے چوپائے ہیں ہم باندھ لے رسی جنہیں
دست و پابندی کا بس وہ دل میں ڈر پیدا کرے

درد کے مارے ہوؤں کا آہ پر ہے انحصار
درد وہ دولت، جو آہوں میں اثر پیدا کرے

رانا سعید دوشی

جگنو سے ٹپکائے اس کی آنکھوں نے
آگ لگا دی تھی بارش کے شعلوں نے

باتوں پر پیلی خاموشی چھائی تھی
نیلی چپ پہنی تھی اس کے ہونٹوں نے

آج اُس نے رونے کو کاندھا مانگا تھا
دامن گیلا کر لیا میرے اشکوں نے

آج کھلے دروازے کو آرام ملا
آج نگاہیں چومیں اُس کے پیروں نے

دل سے نکلا خوف بکھرنے، جھڑنے کا
کی ہے کھل کر بات ہوا سے پتوں نے

غزلیں

کتاب ایک ہے اور انتساب ایک ہی ہے
وہ عشق ہو کہ فقیری نصاب ایک ہی ہے

بس ایک عشق ہے جس کا بدل نہیں کوئی
سوال جتنے کرو گے جواب ایک ہی ہے

رقیب کا بھی بہت احترام کرتا ہوں
کہ اس کا اور مرا انتخاب ایک ہی ہے

ہمارے جذبوں کا ہے خوں بہا تمہاری طرف
تمہارے ساتھ ہمارا حساب ایک ہی ہے

صغیر دل کا یقیناً یہ کوئی واہمہ ہے
کہ جتنی بار بھی دیکھوں وہ خواب ایک ہی ہے

صغیر احمد صغیر

آپ سے کیا کریں گلہ صاحب
آپ تو بن گئے خدا صاحب

ہم نے دیکھا نہ کچھ کہا پھر بھی
کس لیے ہیں خفا خفا صاحب

ہم تہی دست لوٹ آئے ہیں
آپ کہیے کہ کیا ملا صاحب

ہم ترے منہ پہ کہہ نہیں سکتے
تیرے بارے میں جو سنا صاحب

اک نظر ہی صغیر دیکھا تھا
چل پڑا یونہی سلسلہ صاحب

غزلیں

سلگتی آرزوؤں کو پزیرائی نہیں ملتی
میں کیا لکھنے کو پر تولوں کہ تنہائی نہیں ملتی

چٹکتا دیکھ کر کلیوں کو آخر دل پکار اُٹھا
کسی سے تیری صورت اور انگڑائی نہیں ملتی

بھٹکتے پھر رہے ہیں گویا ہم دشتِ قیامت میں
کسی سے اک ذرا سی بھی شناسائی نہیں ملتی

تماشا ہے بہت اچھا مگر یہ کیا تماشا ہے
کہ لاکھوں میں کوئی چشمِ تماشائی نہیں ملتی

دلِ پرواز کا بھی اب کہاں معیار ایسا ہے
یہاں تو اب سمندر سی بھی گہرائی نہیں ملتی

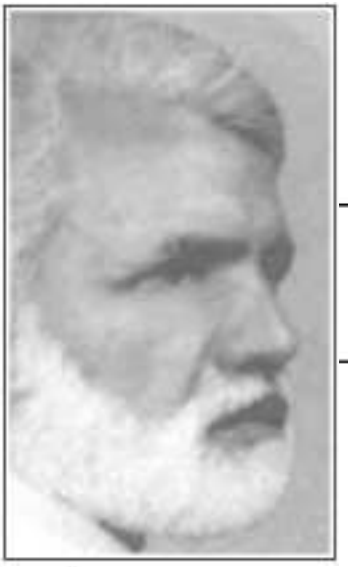

یعقوب پرواز

یہ نظارہ نہ دیکھا تھا فرازِ بام سے پہلے
نکلتا ہے کوئی سورج غروبِ شام سے پہلے

اُسی کے نام کر ڈالے ہیں میں نے رتجگے اپنے
کسی کا نام لیتا ہے جو میرے نام سے پہلے

تمھارے آتشیں لہجے سے ہم خائف نہیں لیکن
ہماری بات تو سُن لو ذرا آرام سے پہلے

رہینِ آب و دانہ ہی سہی آوارگی اپنی
گھروں کو لوٹ آتے ہیں پرندے شام سے پہلے

بہر صورت انہیں رنجِ اسیری تو اُٹھانا ہے
نظر دانے پہ ہے پرواز جن کی دام سے پہلے

غزلیں

پہلے سا لطف کیوں بھلا اِس رات میں نہیں
دم تو ذرا بھی آج تری بات میں نہیں

تنہائی کب دکھائی دے محسوس ہوتی ہے
لگتا ہے آج کوئی مرے ساتھ میں نہیں

کر سکتا تھا جو کرتا رہا ہوں تمام عمر
کچھ بھی تو یارو آج مرے ہاتھ میں نہیں

افسوس ہو نہ پایا کچھ کوشش ضرور کی
کوئی سدھار آج بھی حالات میں نہیں

جو بات تھی جوانی میں یارو وہ اب کہاں
گرمی وہ پہلے جیسی اَب جذبات میں نہیں

افسوس بھی نہیں ہے تری ہار کا مجھے
مجھ کو خوشی بھی کوئی تری مات میں نہیں

زبیر فاروق

ساتھ میرے ہے انوکھا مرے دلدار کا رشتہ
کبھی نفرت کا ہے رشتہ تو کبھی پیار کا رشتہ

دل کا سرطان ہے یہ عشق جسے کہتے ہیں
کچھ تو اس روگ سے بھی ہے دلِ بیمار کا رشتہ

بام پر آتا نہیں کوئی جو بڑی مدت سے
ٹوٹ جائے نہ کہیں اَب در و دیوار کا رشتہ

جھوٹ کا سچ سے تعلق ہے یہی تو فاروق
جیسے کردار سے ہوتا ہے اداکار کا رشتہ

توڑ دینا ہی مناسب ہے اِسے تو فاروق
بوجھ محسوس ہو تو..... ہوتا ہے بیکار کا رشتہ

غزل

چھوڑ کر دُنیا کا مسکن لوٹ کر جانا پڑا
آخر اِک دن اُس کی جانب ہی پلٹ آنا پڑا

آگ پر بھی میں چلا اس امتحانِ شوق میں
پاؤں میں چھالے پہن کر رقص فرمانا پڑا

ہو گئے مجبور ہم اس دل کے ہاتھوں اس طرح
جان کر بھی اک نیا دھوکہ سدا کھانا پڑا

جو اُڑاتے تھے ہمیشہ میری باتوں کا مذاق
ایک دن آخر انھیں لوگوں کا پچھتانا پڑا

لگ گئی شیدا مجھے بھی اس زمانے کی ہوا
جو دیا دُنیا نے مجھ کو اُس کو لوٹانا پڑا

جاوید شیدا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تہی تاثیر تھا ہر شعر خالد
کسی جنگل میں یہ آہو نہیں تھا

غزل

جنونِ عشق میں ہم نے بدن غبار کیا
سو جاں کا دشت بھی وسعت میں بے کنار کیا

فلک سے لے کے مری جان! کہکشاں میں نے
ہر اِک ستارہ تری مانگ پر نثار کیا

نویدِ صبحِ مسرت سُنائی لوگوں کو
اور آپ رات کے آنے کا انتظار کیا

ہم اپنی ضد میں تھے اشرفؔ چٹان کی صورت
سو ایک کارِ محبت ہی بار بار کیا

یقیں کے بدلے میں باندھی گمان کی گٹھڑی
کہ دن چڑھے بھی اندھیروں پہ اعتبار کیا

ہمیں غموں کی کڑی دھوپ سے رہی اُمید
سو ہم نے چھاؤں کے دامن کو تار تار کیا

وہ راستہ جو محبت میں تھا جدائی کا
وہ راستہ بھی مروّت میں اختیار کیا

جو ایک بات مجھے خود سے بھی چھپانی تھی
اُس ایک بات کو چہرے نے اشتہار کیا

جبیں پہ داغ جدائی کے پہلے کیا کم تھے
جو تو نے دل بھی محبت میں داغ دار کیا

اشرف نقوی

غزل

میں اسیرِ خاک ہوں اور ہوں اِسی خاکداں سے جُڑا ہوا
نہیں چاہیے کوئی آسماں کسی آسماں سے جُڑا ہوا

وہ عجیب خواب تھا وصل کا، میں بیاں کروں بھی تو کیا کروں
کہیں اِبتدا سے کٹا ہوا، کہیں درمیاں سے جُڑا ہوا

تو جہاں گیا یہ وہاں گیا، تو جہاں رُکا یہ وہاں رُکا
تھا مِرے غبار کا شوق بھی ترے کارواں سے جُڑا ہوا

مِری تیغ ہاتھ سے گر پڑی، کہ یہ ابتلا تھی بہت بڑی
مِرا یار بھی تھا کھڑا ہوا صفِ دشمناں سے جُڑا ہوا

تِری آنکھ میں نہ اُتر سکا، ترے دل میں گھر نہیں کر سکا
نہ مکاں ہی کوئی بنا سکا میں ترے مکاں سے جُڑا ہوا

مجھے اِتنے کام تھے ہجر میں کہ میں یاد ہی نہیں رکھ سکا
وہ جو اِک تقاضۂ وصل تھا مِرے جسم و جاں سے جُڑا ہوا

ریاض رومانی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

میں کل کا آدمی ہوں، مجھے کل پہ ٹال دے
اے دن! مجھے زوال کی حد سے نکال دے

غزلیں

کچھ لفظ ترک ہو گئے، کچھ لفظ ہیں جدید
اُردو کو چاہئیں ابھی الفاظ کچھ مزید

کیا کیجیے حروف کا دامن ہی تنگ ہے
کچھ قافیوں کی ہو رہی ہے بار بار دید

شاید تمھیں عروض سے کچھ واسطہ نہیں
اوزان منسرح کے ہیں، تم نے کہا مدید

ہر اک غزل میں گوندھیے شعری لوازمات
اجزائے خاص جذب ہوں، بنتا ہے تب ثرید

ہر شعر واہ واہ کا حقدار ہے کہاں
ہر شعر میں ہے شدّتِ جذبات کب شدید

لفظوں کا ہیر پھیر نہیں شعر و شاعری
ایسا سخن کرو کہ زمانہ بنے مرید

محفل نے آفتاب غزل کہہ دیا تجھے
یوں ہو رہی ہے روشنی سے روشنی کشید

آفتاب خان

بھر گئی ہیں زنگ سے گھر کی چابیاں سبھی
اب دھری ہی رہ گئیں وہ نوابیاں سبھی

اہلِ شہر اور بھی جب فریب ساز ہیں
کیوں مجھی میں دیکھتے ہو خرابیاں سبھی

میری آنکھ میں نہیں بے حیائی کی جھلک
کیوں کسی کی ہوں بیاں، بے حجابیاں سبھی

دستِ غیر تھام کر میں ابھی چلا نہیں
منسلک اُسی سے ہیں ہم رکابیاں سبھی

عشق میرا مسئلہ، خود بخود ہی بن گیا
بامِ حسن پر ہوئیں، باریابیاں سبھی

جس قدر تھے نعرہ زن، گردِ وقت ہو گئے
خاک اوڑھے سو گئیں، انقلابیاں سبھی

ہر طرف ہے آفتاب، آفتاب، آفتاب
رشکِ زندگی ہیں یہ کامیابیاں سبھی

غزل

نہیں کوئی خرابی محفلوں میں
پڑے ہیں آپ یونہی وسوسوں میں

خموشی سے رواں ہے کوئی دریا
مگر اک شور سا ہے ساحلوں میں

تمہارے شہر میں گھبرا رہی تھی
محبت جا بسی ہے بستیوں میں

رلا دی میں نے اپنی زندگانی
گنوایا میں نے خود کو دفتروں میں

اسے ہے شوق شعر و شاعری کا
وہ اٹھتا بیٹھتا ہے شاعروں میں

فسردہ ہیں در و دیوار انصر
اداسی پھر رہی ہے آنگنوں میں

انصر حسن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

موت کے ٹھنڈے طاق میں روشن ایک ستارا تھا
عمر بھر اس ہجرت کا منظر، بھول نہ پائیں گے

غزل

گھر کے ہر فرد کو رلاتی ہے
موت جب فیصلہ سناتی ہے

نیند آنا تو ٹھیک ہے لیکن
یہ مجھے خواب کیوں دکھاتی ہے

کم سے کم موت تک تو مانو تم
زندگی ساتھ تو نبھاتی ہے

گرچہ ملتی نہیں ہے مرضی سے
عمر پھر بھی گزر ہی جاتی ہے

ہم کو گمراہ یہ بتاتے ہیں
راہ یہ کس طرف کو جاتی ہے

در بنا دے جو آسمانوں میں
مجھ کو ایسی دعا بھی آتی ہے

دل کا مندر کہ دل کا کعبہ ہو
یاد بس گھنٹیاں بجاتی ہے

جو مرے درد کا حوالہ ہے
یاد اس کی مجھے ستاتی ہے

مجھ کو نوحے سنائی دیتے ہیں
ماں جو تو لوریاں سناتی ہے

جس کا مرکز نہیں ہے کوئی عطاؔ
قوم وہ ٹھوکریں ہی کھاتی ہے

عطاالعزیز

غزل

زندہ باد آپ کی دوستی کا سفر
پل میں طے ہوگیا اک صدی کا سفر

پُرمسرت بھی ہے اور غمناک بھی
کوئے محبوب سے واپسی کا سفر

حاجتیں پاؤں میں باندھتی ہیں بھنور
یونہی ہوتا نہیں ہے کسی کا سفر

حشر میں چاند حرفوں سے ہوگا لکھا
میری پیشانی پہ بندگی کا سفر

ہم نے خود کرلیا اس کو مشکل بہت
ورنہ مشکل نہیں زندگی کا سفر

ماں کی گود ابتدا ، قبر ہے انتہا
صرف اتنا سا ہے آدمی کا سفر

اس کے ساتھ اس طرح گزری اپنی حیات
جیسے دو پاٹ والی ندی کا سفر

جلد آ ورنہ پھر ساتھ ممکن نہیں
رہ گیا بس گھڑی دو گھڑی کا سفر

ذکی طارق (انڈیا)

غزلیں

جیتے جی مرنے پہ تُل جاتا ہے
آدمی عشق میں رُل جاتا ہے

ایسا پاگل ہے جھروکا ہے دل کا
ایک جھونکے ہی سے کُھل جاتا ہے

خالی خوشبو ہی نہیں اُس پہ فدا
خود پذیرائی کو گُل جاتا ہے

داغ ٹھہرے نہ کفِ قاتل پر
رائیگاں خون ہے ڈھل جاتا ہے

عشق کی آنچ جب آتی ہے امرؔ
مجھ سا بے درد بھی گھل جاتا ہے

امر مہکی

لوگ کِس کِس میں مبتلا نکلے
سامنے کیا تھے اور کیا نکلے

اجنبیت بھی کم نہیں اے دوست !
کون پھر کس کا آشنا نکلے

دونوں اِک دوسرے پہ مرتے ہیں
کیا پتا کون بے وفا نکلے

فاصلے قربتوں میں ڈھل جاتے
ہم ہی لیکن گریز پا نکلے

دل ترا نام کِس گھڑی بُھولے
جانے کب ذہن سے پتا نکلے

اِتنا اِترا نہ اُونچا اُڑنے پر
اِس غُبارے سے کب ہوا نکلے

ہیرے نقلی ہیں کیا خبر تھی امرؔ
سنگ ریزے ہی بے بہا نکلے

غزلیں

گئے زمانوں کی اِک صدا ہوں
ازل ابد کو میں جانتا ہوں

میں جمع کرتا تھا اپنے آنسو
گھٹا کی صورت برس پڑا ہوں

یہ شاعری ہے مرا عقیدہ
میں میر و غالب کو مانتا ہوں

جہاں محبت نے سرزنش کی
ادب سے خاموش ہو گیا ہوں

ہے کتنے پانی میں یہ زمانہ
میں اِس کی اوقات جانتا ہوں

ہر ایک جانب ہے ہُو کا عالم
جدھر جدھر بھی میں دیکھتا ہوں

جبیں پہ رکھتا ہوں جگنوؤں کو
ستارے دامن پہ ٹانکتا ہوں

وسیم عباس

جہانِ فن میں متاعِ سخن وری پائی
ترے خیال کو باندھا تو تازگی پائی

اثر کیا ہے تری گرمیِ کلام نے یوں
کہ برف لہجے میں اک آگ ناچتی پائی

کوئی پرندہ کسی شاخ پر نہ پھول کوئی
بہار میں بھی خزاں کی سی ابتری پائی

تری طلب میں ملا شاعری کا فن ہم کو
تری تلاش میں ہم نے سخنوری پائی

رہِ حیات میں ہم نے خرد کے کاندھوں پر
جنوں کا بوجھ اُٹھایا تو آگہی پائی

وسیم مجھ میں کوئی چیز ٹوٹ جاتی ہے
کبھی کبھار ذرا سی بھی گر خوشی پائی

غزل

ساحل پہ میری موج کو آتے ہوئے بھی دیکھ
پانی پہ کشتیوں کے ذرا سلسلے بھی دیکھ

رستوں میں دیکھتا ہے دیوں کو بجھے ہوئے
آنکھوں میں میری آ کے ذرا رت جگے بھی دیکھ

اپنے ہی غم کو غم کا سمندر سمجھ، مگر
میری شبِ شکستہ کے تو دائرے بھی دیکھ

دن جھلملائے میرے سبب، شام خوبرو
"سورج ہوں، میرا رنگ مگر دن ڈھلے بھی دیکھ"

اپنی شکایتوں ہی سے فرصت نہیں تجھے
کیوں درمیاں ہیں ہم میں بہم فاصلے بھی دیکھ

جس شام تو نے غم مری قسمت میں لکھ دیا
اُس شام غم کے ساتھ مرے مسئلے بھی دیکھ

جن میں ہیں چاہتوں کے تبسم سجے ہوئے
افروزؔ! پچھلے سال کے وہ آئینے بھی دیکھ

افروز رضوی

غزل

فرح شاہد

شب کے ٹوٹے ہوئے تاروں کی طرح ہوتا ہے
''آدمی عشق میں بچوں کی طرح ہوتا ہے''

زہر آلودہ زمیں بانجھ ہے ایسی جس پر
پھول بھی نکلے تو کانٹوں کی طرح ہوتا ہے

توڑ کر لائے گا تارے نہ یقیں کر لیکن
عشق میں جھوٹا بھی بچوں کی طرح ہوتا ہے

یہ بصارت یا بصیرت میں عجب رشتہ ہے
بے بصیرت بھی تو اندھوں کی طرح ہوتا ہے

قافلے دور نکل جائیں اگر صحرا میں
پاؤں کا نقش بھی رستوں کی طرح ہوتا ہے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

جھلستی دھوپ کہے چاند چاند اُداسی کو
ہوائے ہجر کو خالد وہ چلتی لُو جانے

غزل

بھلے سے ہو بھرا بازار کوئی
کرے گا کیا بھلا نادار کوئی

اگر میں آستیں کو جھاڑ لیتا
تو شاید دیکھ لیتا یار کوئی

ابھی تو اِس کنارے ہوں اکیلا
مِلے شائد ندی کے پار کوئی

میں تیری دشمنی سے مطمئن ہوں
تو مجھ پر آزما ہتھیار کوئی

پرندے لوٹ آئیں گے یقیناً
اگر کاٹے نہ اب اشجار کوئی

سُنا سکتا ہوں میں بھی داستانیں
ہو محفل میں اگر بیدار کوئی

ہمارا فن بھی کوئی کم نہیں ہے
اگر تم ہو میاں شہکار کوئی

چلو شہزادؔ چھوڑیں شاعری کو
شکم بھرتے ہیں کب اشعار کوئی

شہزاد احمد شیخ

غزل

یہ سنگلاخ ہیں راہیں یہاں پہ آ کے دیکھ
تو دل کی شمع کو اپنی ذرا جلا کے دیکھ

نئے زمانے نے قدریں سبھی بدل ڈالیں
ذرا تو ماضی کے اُن آئینوں میں جا کے دیکھ

جو بانٹتا ہے تُو مُجھ کو بھی وہ عطا کردے
کہ ہاتھ پھیلے ہوئے ہیں ترے گدا کے دیکھ

بچھڑ کے اُس سے بھلا ملتا ہے سکون کہاں
یقیں نہیں ہے تو میرے قریب آ کے دیکھ

صدا یہ غیب سے آتی ہے میرے کانوں میں
مِری طرف ذرا دستِ طلب بڑھا کے دیکھ

ہر ایک سجدے میں اُس کی رضا بھی شامل ہے
تو اُسکے در پہ اے تاثیر سر جھکا کے دیکھ

تاثیر نقوی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

یہ سفر ، سَر بہ سَر رائیگاں بھی نہیں
کارِ دل محض کارِ زیاں بھی نہیں

غزلیں

اک ضرورت بنا لیا ہے اُسے
میں نے عادت بنا لیا ہے اُسے

عکس آنکھوں میں بھر لیا اُس کا
اور بصارت بنا لیا ہے اُسے

دھڑکنوں میں اُتار کر اُس کو
دل کی راحت بنا لیا ہے اُسے

دہر میرے لیے ہے بے مقصد
جب سے چاہت بنا لیا ہے اُسے

خوف قابو جو آ گیا میرے
میں نے طاقت بنا لیا ہے اُسے

اس طرح جھوٹ بولتا ہے وہ
گو سیاست بنا لیا ہے اُسے

تھی عبادت سخنوری ارشدؔ
تم نے شہرت بنا لیا ہے اُسے

ارشد محمود ارشد

آنکھ کی کوکھ کا پلا دکھ ہے
یہ جو پلکوں پہ ناچتا دکھ ہے

میں اُسے بھول ہی نہیں پایا
اس لیے بھی ہرا بھرا دکھ ہے

بھوک بھی غم ہے زندگانی کا
اور محبت سے ماورا دکھ ہے

میں نے بانٹا خلوص لوگوں میں
اک اُسی کی تو یہ سزا دکھ ہے

تم جو مرنے کی بات کرتے ہو
دوست تیرا نیا نیا دکھ ہے

اُس کنارے پہ کیا خوشی ہو گی
اِس کنارے کی ابتلا دکھ ہے

کاش اک بار پوچھ لیتا وہ
یار ارشدؔ بتا تو کیا دکھ ہے

غزل

گھر سے قدم نکالنا آزار ہو گیا
آپس کا میل جول بھی دشوار ہو گیا

خود پر جو آ پڑی ہے تو سمجھے، بلا ہے کیا
سنتے تھے عشق میں کوئی بیمار ہو گیا

پوچھا جو آپ دل کو لبھاتے ہیں کس طرح
چہرہ وہیں پہ یار کا گلنار ہو گیا

سن کر اسے ہے تلخ نوائی کی خو بہت
لہجہ مری زبان کا تلوار ہو گیا

اپنے ہی آپ پر نہیں پڑتے قدم مرے
سایا ہی میری راہ کی دیوار ہو گیا

میری غزل جب اس کے لبوں سے ادا ہوئی
سرمست ہو گیا ، کوئی سرشار ہو گیا

وہ کام کر رہا ہے جو کرنے نہیں اسے
گویا یہ دل بھی فوج کا سالار ہو گیا

آمد سے آپ کی دلِ محزوں ہے باغ باغ
اچھا ہوا کہ آپ کا دیدار ہو گیا

ساقی کی بزم میں یہی چلتا ہے رات بھر
اقرار ہو گیا، کبھی انکار ہو گیا

آصفؔ ہے راہبر وہی، جو قوم کے لیے
ظلم و ستم سے بر سرِ پیکار ہو گیا

آصف شفیع

غزل

اندھیری شب سے عقیدت جتا رہے ہیں لوگ
کہ روشنی کو نشانہ بنا رہے ہیں لوگ

وہ آسمان کی جانب یقین رستے ہیں
گماں کے زور سے جن کو مٹا رہے ہیں لوگ

زمیں پہ خیر کے کاموں سے دور ہیں اب تک
زمیں پہ صرف مسائل بنا رہے ہیں لوگ

وہاں کی نسل سمجھتی ہے زندگی کو بوجھ
جہاں پہ ریل کی پٹڑی بچھا رہے ہیں لوگ

وہ بے بسی ہے کہ کردار خوف سے چپ ہیں
بزورِ تیغ کہانی چرا رہے ہیں لوگ

یہ روشنی بھی اسی کھیل کی کھلاڑی ہے
مرے وجود کو جس میں بجھا رہے ہیں لوگ

فلک سے رزق کا اب سلسلہ دوبارہ ہو
زمیں پہ بھوک کے پودے اگا رہے ہیں لوگ

نئی صدی میں روایات مٹنے والی ہیں
بطورِ خاص محبت مٹا رہے ہیں لوگ

ہمارے گاؤں کو آتش کدہ بناتے ہوئے
ہمارے امن پہ پیسہ بنا رہے ہیں لوگ

شعورِ ذات سے خلقت کو دور رکھتے ہیں
قدم قدم پہ تماشا لگا رہے ہیں لوگ

جہاں پہ کھیت تھے ان پر بنا رہے ہیں گھر
زمیں کو مفت میں دشمن بنا رہے ہیں لوگ

نئی صدی ہے مگر غار کا زمانہ ہے
پرائی آگ سے بستی جلا رہے ہیں لوگ

اسحاق وردگ

غزلیں

چھپا کے رکھا ہوا خواب بھی چرا لیا ہے
جو راستے میں پڑا تھا گلاب اٹھا لیا ہے

فضا میں رنگ بکھرنے لگے ہیں چشمک سے
لبوں نے حسن مناظر کا سب چرا لیا ہے

مقام بدلا تو چہرے ضرور بدلیں گے
قریب و دور کا ہر شخص آزما لیا ہے

پھر ایک بار نہیں مانی ذہن کی دل نے
پرائی آگ میں پھر ہاتھ کو جلا لیا ہے

تو کیا ضروری ہے باقی رہے نشاں اس کا
ہجوم میں سے اگر راستہ بنا لیا ہے

اخیر نکلے گا جاذبؔ حسیں تصور ہی
کوئی سراغ اگر منزلوں کا پا لیا ہے

اکرم جاذب

اداس چہرے اداس منظر یونہی ہمیشہ نہیں رہیں گے
ہواؤں کے رخ بدل گئے جب تو صحرا صحرا نہیں رہیں گے

منافرت کا سبق پڑھا کے دکانِ کینہ چلانے والے؛
جفاداروں کے کہے پہ طوفاں سدا تو برپا نہیں رہیں گے

یہ زندگی کے سیاہ گوشے منور اب آگہی سے ہوں گے
کریہہ منظر زیادہ مدت زمیں کا حصہ نہیں رہیں گے

خیال رکھنا کہ جذبوں کی یہ ضرور اتریں گی بھری موجیں
چڑھے ہوئے ہیں کناروں تک جو ہمیشہ دریا نہیں رہیں گے

بہار آئی تو کونپلوں سے گلاب و برگ و ثمر بنیں گے
بکھرتے پتے اداس موسم مرا حوالہ نہیں رہیں گے

سفر کی دشواریوں کو جاذبؔ اٹل ارادے بتا رہے ہیں
شکستہ پائی اگر رہے گی تو پا شکستہ نہیں رہیں گے

غزل

سوئی آنکھوں میں جاگتی دنیا
کیا عجب تھی وہ خواب کی دنیا

کیسے میرے خلاف جائے گی
یہ مرے ہاتھ کی بنی دنیا

نام تیرا چمک اٹھا اس پر
میں نے کاغذ پہ جب لکھی دنیا

تیری تصویر ہے نگاہوں میں
یعنی میں نے سمیٹ لی دنیا

مستقل درد سر بنے ہوئے ہیں
عارضی لوگ ، عارضی دنیا

آگ میں نے لگا دی خوابوں کو
رات آنکھوں میں جل بجھی دنیا

تجھ کو رفعتؔ نہ مل سکے گی کبھی
جا تجھے لکھ کے آج دی دنیا

رفعت وحید

غزل

نکل آئے خودی کے بال و پر آہستہ آہستہ
ہوئی راہِ تمنا مختصر آہستہ آہستہ

اُسے احساس تھا کتنا مری پُراشک آنکھوں کا
کیا برباد خوابوں کا نگر آہستہ آہستہ

فضا میں نور چھنتا دیکھ کر اُس نقرئی تن سے
فدا ہونے لگے شمس و قمر آہستہ آہستہ

ذرا آؤ وجودِ تیرگی کو اس طرح بھینچیں
سحر نکلے شبِ غم چیر کر آہستہ آہستہ

اب اتنا ہے اُٹھا کر اِک نظر وہ دیکھ لیتا ہے
ہوئی ہے پُراثر کچھ چشمِ تر آہستہ آہستہ

بڑھاپے کی طرف بڑھنے لگے جب سے قدم اپنے
ہوئے جاتے ہیں غم بھی ہمسفر آہستہ آہستہ

دلی تسکین پہنچی مضطرب روحِ تمنا کو
ہوا سحرِ تمنا کارگر آہستہ آہستہ

ابھی تو ہیں پریشاں لوگ اس مہنگائی کے ہاتھوں
ابھی فرحانؔ ہوں گے دربدر آہستہ آہستہ

سرور فرحان

غزل

یہ جو ہلتی ہے زمیں، زیرِ زمیں ہے کچھ تو
یعنی اِس دل کے خرابے میں مکیں ہے کچھ تو

اُس کے ملنے کا بَھلا جو بھی نتیجہ نکلے
لیکن اِس بار مرے دل کو یقیں ہے کچھ تو

بند آنکھوں سے کوئی خواب نما جھانکتا ہے
یہ جو اُلجھن ہے مری اپنے تئیں، ہے کچھ تو

کچھ تو اندازِ محبت بھی الگ ہے اُس کا
اور ضرورت سے زیادہ بھی حسیں ہے کچھ تو

جب میں سوتا ہوں تو اُٹھ کر کوئی کہتا ہے ظہورؔ
میں چلا جاؤں اگر کام نہیں ہے کچھ تو

ظہور چوہان

انتخاب

– خالد احمد –

نعمان منظور

پھر وہی مہرباں ہوا آئی
اے مری بے چراغ تنہائی

غزل

محمد علی ایاز

اگر یوں مارو گے تم شہر کے دوانوں کو
تو کون رونقیں بخشے گا قید خانوں کو

یہ کس نے زہر ہے گھولا مری فضاؤں میں
ترس رہے ہیں پرندے سبھی اڑانوں کو

ترے بلانے پہ رب کی طرف نہیں آتے
یہ کیا ہوا ہے مؤذن تری اذانوں کو

یہ کس نے خواب میں پھر سے مجھے پکارا ہے
بھلی لگی ہے یہ آواز میرے کانوں کو

یہیں پہ بیٹھتے ہیں شہر کے سب اہلِ زباں
خدایا! رکھنا تو آباد چائے خانوں کو

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خاک پر خاک کی ڈھیریاں رہ گئیں
آدمی اُٹھ گئے ، نیکیاں رہ گئیں

غزل

یہ وقتِ ہجر میں اب پاس بھی نہیں ہوتا
اُسے ہمارا تو احساس بھی نہیں ہوتا

یہ شعر و شاعری ہر آدمی کا شوق نہیں
ہر ایک آدمی حساس بھی نہیں ہوتا

یہ میرے دوست سمندر نہیں ہیں آنکھوں میں
یہ اشک ریزۂ الماس بھی نہیں ہوتا

میں جانتا ہوں کہ مشکل ہے عمر بھر ملنا
مگر یہ دل ہے کہ بے آس بھی نہیں ہوتا

یہ چائے خانے بھی ویران ہیں مہینوں سے
سخنوروں کا تو اجلاس بھی نہیں ہوتا

غزل تو ہوتی ہے لیکن کبھی کبھی تو اسدؔ
بیاض و خامہ و قرطاس بھی نہیں ہوتا

اسد اعوان

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

جب بونے لگا بیج خیالات کے خالد
ہر لفظ کا دامن مجھے بنجر نظر آیا

غزلیں

فقط دو چار سانسوں کے سہارے پر پڑا تھا
میں اک ارضِ تنفس کے کنارے پر پڑا تھا

مجھے درکار تھا انجم شماری کو نیا اب
کہ پہلا آسماں اک آدھ تارے پر پڑا تھا

ہمارے چل رہے تھے ہجر سے اچھے مراسم
وگرنہ وصل تو اک استخارے پر پڑا تھا

محبت کی تمہارے بعد کوشش رائیگاں تھی
خسارا ہی مجھے پیہم خسارے پر پڑا تھا

مرا ہر عضو ٹھنڈے موسموں تک آ گیا پر
یہ دل اب بھی کہیں عزمیؔ شرارے پر پڑا تھا

عزم الحسنین عزمی

دل و دماغ کھڑے گرد درمیان میں میں
گھرا ہوا ہوں ازل سے ہی مُغتیان میں میں

کسے ہے اصل کی پہچان میرے شہر میں، سو
پڑا رہوں گا بڑی دیر تک دکان میں میں

یہ آسمان کی چھت، یہ زمین کا بستر
کہ بے امان بھی بیٹھا ہوا امان میں میں

اب آ گیا ہوں ترے شہر میں تو ڈھونڈ ہی لوں
یہیں کہیں پہ پڑا ہوں کسی مکان میں میں

بس ایک چیخ کی صورت ہی جی رہی تھی صدا
جب اس کو گفتگو دینے گیا تھا دان میں میں

سنانے والا کوئی تھا مرا عدو ورنہ
کہیں کہیں پہ ابھی بھی تھا داستان میں میں

غزل

کئی دلوں کی طلب ہے، تمہاری شب مرا دن
پر اپنے پاس ہی کب ہے، تمہاری شب مرا دن

شبِ فراق بھی دونوں کی اب نہیں یکساں
یہ فاصلہ بھی عجب ہے، تمہاری شب مرا دن

تم آفتاب کے جیسے کئی برس چمکے
تو کیا ہوا کہ جو اَب ہے، تمہاری شب مرا دن

تمھیں سکون کی چاہت مجھے تلاشِ معاش
کچھ ایسے نذرِ طرب ہے، تمہاری شب مرا دن

پلٹ دیا ہے مرا وقت رنجگوں نے یوں
کہ بس انہی کے سبب ہے، تمہاری شب مرا دن

یہ کیا سفر ہے کہ عدنانؔ جس کے رستے میں
کوئی خبر نہیں کب ہے، تمہاری شب مرا دن

عدنان خالد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

جب بونے لگا بیج خیالات کے خالد
ہر لفظ کا دامن مجھے بنجر نظر آیا

غزل

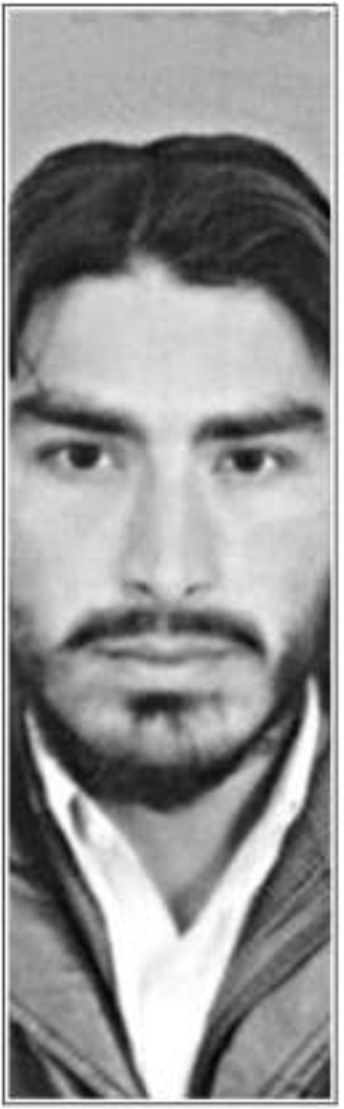

دلربا کوئی ہے
آپ سا کوئی ہے

دیکھتا کوئی ہے
سوچتا کوئی ہے

بلبلیں نوحہ خواں
گل کھلا کوئی ہے

کیا ہوا، کیوں ہوا
پوچھتا کوئی ہے

خامشی چیختی ہے
کوئی تھا، کوئی ہے

شہر میں ہم سا بھی
سر پھرا کوئی ہے

بن چلے منزلیں
پا گیا کوئی ہے

قافلے کا مرے
رہنما کوئی ہے

احمد محسود

غزل

کرتا ہوں جو رات دن سفر میں
پہنچوں گا کبھی تو اپنے گھر میں

آنکھوں سے چھڑا کے ہاتھ اپنا
اب چلتا ہوں دل سے دیکھ کر میں

اِک شعر سے کیسے کھل سکے گا
بیزار ہوں خود سے کس قدر میں

پوچھو کبھی اپنی یاد سے تم
کیوں کہتا ہوں شام کو سحر میں

تعبیر میں ڈوبے رتجگوں سے
اب دیتا ہوں خواب کی خبر میں

حالت ہی بتا رہی ہے میری
کیا کرتا رہا ہوں عمر بھر میں

بیٹھا رہا رات کے سرہانے
لے کر کسی یاد کی سحر میں

اِک جاگتا خواب یاد کر کے
سویا رہا کل بھی رات بھر میں

آنکھوں کی سلامتی کا مطلب
پھر دیکھوں گا اُس کو اِک نظر میں

کچھ ایسے غلط نہیں ہیں احباب
لگتا بھی نہیں ہوں معتبر میں

اِک لفظ ہے میری آپ بیتی
تاخیر ہوں ، قصہ مختصر میں

کنور امتیاز احمد

ریاض حسین زیدی: ناقابلِ فراموش•

۱۹۹۵ء کی بات ہے۔ بورے والا کالج کے پتے پر ایک اجنبی کا خط ملا، ایسا خوش خط کہ خود کو 'خوش بخت' یقین کرنا جواز تراشنے لگا۔ مکتوب نگار کا اسمِ گرامی تھا: پروفیسر سید ریاض حسین زیدی! Content یہ تھا کہ ''ادب سرائے'' کے زیرِ اہتمام ضلع کونسل ہال میں معروف فکشن رائٹر محمد سعید شیخ کے ناولٹ: ''اقبالِ جرم'' کی تعارفی تقریب منعقد ہو رہی ہے جس میں تمھاری طرف سے ایک مضمون پڑھا جانا ضروری ہے! دو تین روز بعد زیدی صاحب نے ایک اور خوبصورت خط لکھا، ساتھ مذکورہ کتاب بھی ارسال کر دی۔ راقم وقت مقررہ پر جب مقام تقریب: ساہیوال پہنچا تو حاضرین میں سے کسی سے استفسار کیا کہ موجودگان میں زیدی صاحب کون ہیں؟ ان صاحب کے اشارے نے جنھیں مشارٌ الیہ قرار دیا، وہ شخصیت اس عاجز کے بالکل سامنے ہی جلوہ افروز تھی۔ سو، جھجکتے ہوئے اس کلین شیوڈ کو ہسارِ ملاحت سے مخاطب ہوئے اور اپنا تعارف کرایا۔ اس قدر تپاک سے ملے کہ روح سرشار ہو گئی! یہ پہلی ملاقات عمروں کے قدرے تفاوت کے باوصف بے تکلف دوستی میں بدل گئی؛ پھر زیدی صاحب نے جب بھی ساہیوال طلب فرمایا؛ حاضری کو اعزاز سمجھا! ۱۹۹۸ء میں پروفیسر اورنگ زیب کی کہانیوں کے مجموعے: ''لیڈی سپرنٹنڈنٹ'' کی تقریبِ رونمائی میں ملنا ہوا تو اپنی پریشانی کا ذکر کیا کہ پبلک سروس کمشن والوں نے سروس کی پازیب میں اگلے گریڈ کا گھنگرو باندھ کر بے گھر کر دیا ہے، سمجھ نہیں آ رہا کہاں ٹھیکی لگائی جائے؟ زیدی صاحب

جمیل احمد عدیل

• اپنے مکرم حبیب پروفیسر سید ریاض حسین زیدی کی ریٹائرمنٹ کے موقع پر یہ (غیر مطبوعہ) تحریر: ۲۹ مارچ ۲۰۰۰ء کو قلمبند ہوئی!!

اپنے مخصوص اسلوب میں گویا ہوئے: ''میاں! ہم دیدہ و دل فرش راہ کیے ہوئے ہیں، اے پی کی سیٹ منتظر ہے؛ ہمارے شعبے میں تمھاری آمد گراں قدر اضافہ متصور ہوگی!!'' اور پھر یہ ہوا کہ سنگِ آہن ربا کی مثال زیدی صاحب کی محبت نے اس ناکارہ لوہے کو اپنی جانب کھینچ لیا۔ جب جوائننگ کا مرحلہ آیا تو باہمت زیدی صاحب خود اس عاصی کو لے کر پرنسپل ڈاکٹر محمد اشرف کے پاس گئے اور تعارف میں بطور خاص یہ جملہ ادا کیا: ''بحمد اللہ آپ کی طرح یہ بھی مسلمان ہیں!'' یوں اپنے ممدوح، مربی اور محسن کے رفیق کار ہونے کا شرف مل گیا اور ایک دیرینہ خواب بھی پورا ہو گیا کہ گورنمنٹ کالج ساہیوال سے وابستگی کی اِک تمنا تھی کیونکہ والد صاحب اپنے زمانہ طالب علمی کو یاد کر کے اس کالج کا ہمیشہ بڑے والہانہ انداز میں ذکر کیا کرتے تھے!! لیکن جی سی ساہیوال آئے ہوئے ابھی ڈیڑھ برس کا مختصر عرصہ ہی گزرا ہے کہ زیدی صاحب اپنی مدت ملازمت مکمل ہونے کے سبب اس عظیم مادرِ علمی کو خیرباد کہہ رہے ہیں اور یہ سطور لکھتے ہوئے سوچ رہا ہوں کہ پروفیسر سید محمد اکبر ایسے شفیق، خلیق اور انیق استاد کی ریٹائرمنٹ کے بعد یہ دوسرا سانحہ ہے جسے سہنا پڑ رہا ہے! اسی طرح شنید ہے پروفیسر علی اظہر نقوی ایسی دلکش، دلربا اور شگفتہ مزاج شخصیت بھی چند ماہ بعد اس کالج کو انگریزی میں ''گڈ بائی'' کہہ کر اپنا ناتا منقطع کر لیں گی اور متشرع و متدین میاں خلیل الرحمٰن بھی جلد ہی اس دنیاداری کے جھنجھٹوں سے قطع تعلق کر کے ہمیں اداس کر جائیں گے!!

صاحبو! محبت کے یہ سلسلے بھی عجیب ہیں، سنہری رفاقتوں کی جھلمل پر مشتمل چند دل افروز ساعتیں نصیب ہوتی ہیں کہ اگلا موڑ جدائی کا استقبال کرنے کے لیے اپنی بے مروت بانہیں وا کیے ہوئے موجود ہوتا ہے۔ پروفیسر عبدالقیوم صبا کا شعر یاد آ رہا ہے:

حافظہ ویران ہونے کے لیے آباد تھا
نام کچھ ہونٹوں تک آئے تھے بسرنے کے لیے

.....

جہاں تک پروفیسر سید ریاض حسین زیدی کی مرنجاں مرنج اور فرخ نہاد شخصیت کا تعلق ہے تو ایک زمانہ آپ کے اوصاف حمیدہ کا معترف ہے! حقیقت یہ ہے ان پانچ برسوں میں فی الاصل زیدی صاحب سے ایک ہی بار ملا ہوں کہ باقی تمام ملاقاتیں اسی ایک ملاقات کے تسلسل میں ہوئی ہیں۔ ساری باتیں بس ایک بات کی توسیع قرار پائی ہیں۔ جی ہاں! 'محبت' زیدی صاحب کی ذات کا منور مرکزہ ہے! تخلیقی جمالیات کی جملہ جہات سے متصف و معمور پروفیسر زیدی ایک غایت درجہ ملنسار ہستی ہیں! یہ ہو نہیں سکتا کہ وہ کبھی اپنے مخاطب کو چمکدار لذیذ تحسینی جملے کے ارمغان سے محروم رکھیں! یوں ہر فرد ان سے مل کر مسرت اور نشاط کی گداز گرمی سے لطف اندوز ہوتا ہے اور سرور کی لذت کو اپنے رگ و پے

میں اس وقت تک محسوس کرتا رہتا ہے جب تلک اس کا سامنا کسی تند خو سے نہیں ہو جاتا۔ سچی بات ہے زیدی صاحب کے اس ہنر کا راقم تو بہت قائل ہے، کئی بار جی چاہا ہے کہ ان کے سامنے باقاعدہ زانوئے تلمذ تہ کیا جائے تا کہ 'زانوئے تلمذ' تک رسائی کا قرینہ عطا ہو جائے۔ دراصل زیدی صاحب کو خوش رہنا اور خوش رکھنا آتا ہے۔ درآں حالے کہ یہ کبھی زہر ہلاہل کو قند نہیں کہتے مگر پھر بھی ان سے اپنے خفا ہوتے ہیں نہ بیگانے ناخوش! ان کے ڈرائنگ روم میں پروفیسر عبدالباری دولہ اور پروفیسر آصف تنویر؛ پروفیسر شبیر احمد مغل اور پروفیسر عبدالرؤف دولہ بیک وقت نہ صرف موجود ہوتے ہیں بلکہ مسرور و مطمئن بھی نظر آتے ہیں؛ شاید متخالف ہوائیں اور متعارض انتہائیں ان کے وجود میں آ کر گم ہو جاتی ہیں۔ بہرنوع اب ایسی غیر متنازع شخصیات دن بدن کم ہوتی جا رہی ہیں۔

زیدی صاحب کے تلامذہ سیکڑوں میں نہیں یقیناً ہزاروں میں ہیں۔ سب کے سب ان پر دل و جان سے فریفتہ ہیں، کیونکہ ان کا انداز ہٹو بچو والا نہیں، بے جا رعب جھاڑنا ان کی ملائم شخصیت میں شامل ہی نہیں ہوا۔ عزتِ نفس مجروح کرنے کا گناہ ان سے سرزد نہیں ہوا؛ ہاں جب معاملہ اصولی ہو تو سیّد کا جلال دیکھنے والا ہوتا ہے! ان خاص مواقع پر ان کو لگی لپٹی رکھنی نہیں آتی، اسی لیے ہمارے فلسفی دوست اور ہم نشیں پروفیسر محمد خاں رانجھا انھیں اپنا ہیرو مانتے ہیں! جبکہ راقم مذکورہ طریق کار سے نظری اختلاف کے سبب اپنا ہیرو اکبر شاہ صاحب کو قرار دینے پر مصر رہتا ہے؛ اسی لیے ایک مکان کے دونوں مکینوں میں اکثر مناظرہ جاری رہتا ہے؛ کبھی جیت جلالی سید کی ہوتی ہے تو کبھی جمالی سید فتح سے ہمکنار ہوتا ہے؛ لیکن چوری چوری راقم اور رانجھا ایک دوسرے کے ہیرو کی ورشپ کر کے تھوڑی بہت بوٹی بھی لگا لیتے ہیں، آخر بے ایمانی پر ہمارا بھی کچھ حق ہے!!

بات ہو رہی تھی زیدی صاحب کی، یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ بحیثیت استاد طالب علم سے تعلق کو جس منفرد اسلوب، انداز اور اخلاص کی شرائط پوری کرتے ہوئے تدریس کو انھوں نے اپنایا وہ انھی سے مخصوص ہو کر رہ گیا! ان کے لیکچر میں طلبہ کو بار بار گھڑی کی طرف نہیں دیکھنا پڑتا بلکہ وہ ان کی مزے مزے کی اور بے حد دلچسپ باتوں میں اس قدر کھو جاتے ہیں کہ ان سادہ خاطروں کو خبر ہی نہیں ہو پاتی؛ زیدی صاحب تو ان سے ہاتھ کر گئے ہیں؛ ہنسی ہنسی میں انھیں پڑھا گئے ہیں!!

ہمارے سینئر اساتذہ تائید کریں گے کہ جس کالج میں ریاض حسین زیدی نہیں ہوتا وہاں شعر و ادب کا نہال نشو و نما نہیں پا سکتا۔ زیدی صاحب جس کالج میں بھی تعینات رہے، طلبہ میں علم و فن کا ذوقِ لطیف و نظیف برابر پروان چڑھاتے رہے۔ بالخصوص گورنمنٹ کالج ساہیوال کی سرزمین میں اس شجر کی آبیاری کے حوالے سے جتنا حصہ زیدی صاحب کا

ہے، غالباً نہیں یقیناً کسی اور کا نہیں ! ادبی تقریبات کی ایک طویل کہکشاں ہے جس کے ہر چمکتے ستارے کے ہر دمکتے ذرے میں زیدی صاحب کی شبانہ روز محنتوں اور کاوشوں کا لہو رقصاں ہے! ان کی اس آہن گداز مشقت پر جتنی بھی داد دی جائے کم ہے!!

علاوہ ازیں پروفیسر سید ریاض حسین زیدی ملکی سطح پر ایک باوقار علمی و ادبی شخصیت کے طور پر قابل رشک پہچان کے مالک ہیں۔ صفِ اوّل کے جرائد میں ان کی بلند پایہ منثور و منظوم تخلیقات گذشتہ چالیس برس سے متواتر چھپ رہی ہیں۔ پھر ''ادب سرائے'' سے موسوم جو تنظیم ان سے منسوب ہے، اس کا حوالہ بھی اس قدر معتبر ہے کہ اسے ساہیوال کی ادبی اکیڈمی کا درجہ حاصل ہو چکا ہے۔

آخر میں مکرم زیدی صاحب کے ایک اور طغرائے امتیاز یعنی خداداد خوبی کا ذکر ضرور کیا جائے گا کہ آپ بے حساب قادرالکلام شخصیت ہیں! مشکل الفاظ اور ادق بندشوں کا نامختتم خزینہ ہمہ دم ان کے تصرف میں رہتا ہے۔ ان نادر کھنکتے سکوں کے زور پر تقریبات کے میلے میں جس کھلے دل سے یہ خرچ کرتے ہیں، یار لوگ اس فیاضی پر رشک کرتے ہیں! سٹیج پر آ کر بڑے بڑوں کی بولتی بند ہو جاتی ہے مگر زیدی صاحب کی طبع ہم نے تو کبھی رکتی ہوئی نہیں دیکھی۔ لطائف و ظرائف کا بھی اچھا خاصا ذخیرہ ان کے پاس محفوظ ہے۔ لطیفے کا اصل کمال اس کا برمحل استعمال اور پیش کش ہے۔ ہمارے کالج میں پروفیسر یحییٰ شاہد اور پروفیسر علی اظہر نقوی بھی اس فن کے امام ہونے کے مدعی ہیں، پر زیدی صاحب امام الائمہ ٹھیرے! زیدی صاحب اس برجستہ انداز میں ذکاوت کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ ان کی ذہانت اور ٹائمنگ پر ہر کوئی اش اش کر اٹھتا ہے اور پھر ترنم سے جب سماں باندھتے ہیں تو احباب کیف کی بارش میں بھیگ بھیگ جاتے ہیں! زیدی صاحب ایک حد تک خود بین و خود آرا بھی ہیں؛ انھیں اپنی دانست میں اپنی صلاحیتوں کا صحیح صحیح اندازہ ہے؛ اسی لیے اپنے شاندار لطیفے اور تیکھے جملے پر ایسا جاندار قہقہہ ماحول کے سپرد کرتے ہیں کہ ایک بار تو دھرتی ہل جاتی ہے؛ اتنی خالص ہنسی ایک سچے آدمی کی ہو سکتی ہے!! لاریب زیدی صاحب ایک مجلسی انسان بلکہ بزم پرور شخص ہیں۔ قلبی دامنِ ادب سے وابستہ رہ کر اگر تھوڑی سی لبرٹی لے لی جائے تو ان کی محفل آرائی کے جوہر پر انھیں کلام نگر کا: 'حضرت خواجہ تقریب نواز گفتگو دراز' کا لقب دیا جا سکتا ہے!!

جی تو اور بھی بہت سی باتیں کرنے اور کہنے کو چاہتا ہے مگر قلیل البضاعتی کا احساس دامنگیر ہے کہ زیدی صاحب بہرطور بزرگ ہیں، علیم و حلیم ہیں، پھر دم رخصت لفظ و ترکیب میں ترتیب و توازن کہاں رہتا ہے، کیا کہیں ان اداس لمحوں میں بجز اس کے:

سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے رو
بدھنا ایسی رین کو بھور کبھی نہ ہو

☆☆☆☆☆

یاری خان [خاکہ و مزاح]

یاور علی خان نام رکھا گیا تھا اس کا گھر میں، جو گھر میں ہی بگڑ کر یار لی خان اور بعد میں یاری خان بن گیا- یہی بگڑا ہوا نام گھر سے نکل کر محلے اور وہاں سے سفر کرتا ہوا پورے گاؤں میں مشہور ہو گیا- نام بگاڑنے میں ہمارے گھر والے اور والدین ید طولیٰ رکھتے ہیں- پہلے تو اپنے بچے کے لئے بہترین نام منتخب کرتے ہیں، بعد میں اسی نام کا حشر نشر کر دیتے ہیں- پنجاب اور سندھ کا تو نہیں پتا کہ وہ اپنے بچوں کو کونسی سزا دیتے ہیں- البتہ ہمارے صوبہ سرحد میں ہمارے والدین یہ خاص صفت لے کر پیدا ہوتے ہیں کہ وہ آپ کے اچھے بھلے نام کا ستیاناس کر دیتے ہیں- گل محمد کو گلے یا گلو بنا دیا، بخت زاہد کو بختے، نواز خان کو نوازے، نعمان علی کو نعمانے اور کریم خان کو کریمے بنا دیتے ہیں- پتہ نہیں ان کو ان ناموں سے کیا دشمنی ہے- اور زرا سوچیں تو، وہ اچھے خاصے مردانہ نام کو زنانہ بنا کر اس کی جنس ہی تبدیل کر دیتے ہیں- شائد ان کو مرد کو نامرد بنانے میں تسکین ملتی ہے- قصہ مختصر یاور علی خان، یاری خان بن کر پروان چڑھا- ہمارے پڑوس میں رہنے کے ساتھ ساتھ میرا ہم جماعت بھی تھا اس لئے اس کے کردہ و ناکردہ گناہوں اور خطاؤں کا میں ہی عینی شاہد اور گواہ ہوں اور بعض امور میں اس کا شریک بھی رہا ہوں- چنانچہ مجھے بھی اس کے کرتوتوں میں برابر کا شریک تصور کیا جائے-

کلاس میں یاری خان رولنگ پارٹی کا سپہ سالار تھا- میں بھی اس کے دستے کا ایک رکن تھا- وہ چار بہنوں کے بعد بڑی منتوں کے بعد پیدا ہوا تھا اس لئے والدین نے اس کی "نر" حیثیت کو چھپایا اور اسے لڑکی ظاہر کیا تا کہ محلے کی خواتین اور اپنے پرائے اسے نظر نہ لگا سکیں -اسی غرض سے بچپن میں اسے رنگین کپڑے پہنائے جاتے اور کانوں میں باقاعدہ بالیاں اویزاں کرادی جاتی رہیں کہ اس طرح وہ نظر بد سے محفوظ رہے -نظر بد تو کجا؛ اس کے بعد جو خاندان میں لڑکوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا تو رکنے میں نہیں آیا -مسلسل پانچ لڑکے پیدا ہوئے اور لڑکیوں کو ملا کے کل تعداد نو تک پہنچ گئی- کہا کرتے تھے، میرے والدین نے ملکی آبادی میں ہونے والے اضافے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے- سدا کا بدشگون تھا- امید اور اطمینان والی کوئی بات اس کی زبان سے کبھی

نور کمال شاہ

نہیں نکلی - منہ پر آئی ہوئی کھانسی اور زبان ہر آئی بات کو روکنا آزادی کی توہین سمجھتا تھا- ہمیشہ بس کی چھت پر سفر کرتا تھا - کہتا تھا سفر کا سارا لطف یہیں اوپر ہی ملتا ہے- کسی تنازعے کی صورت میں پہلے ہاتھ پیر چلا کر مخاطب اور مخالف کو زیر کر دیتا تھا، بعد میں دلائل پیش کرتا تھا - ظالم بلا کا حافظہ لے کر پیدا ہوا تھا - برسوں پہلے کے واقعات مع تاریخوں کے اسے یاد تھے- اسے یہ تک یاد ہوتا کہ پچھلی بدھ کو کونسی سبزی پکی تھی گھر میں اور گزشتہ مہینے کی تین تاریخ کو وہ کس کس سے ملا تھا، یا کون سی تاریخ کو گھر کے پکے سالن کو مسترد کر کے اس نے ہمسایوں سے سالن منگوا کر کھایا تھا - سینکڑوں لڑکیوں کے نام اسے ازبر تھے - صرف یہاں تک نہیں بلکہ ان کے مکان نمبر اور محلے تک کا پتہ تھا اسے - اس طرح اس کے معاشقے بھی درجنوں میں تھے جو بیشتر ناکام ثابت ہوئے تھے - چونکہ گھر میں پلنے والے نو بچوں میں وہ پہلے "نر" بچہ تھا اس لئے اولیت کا مقام اور درجہ اسے ہی حاصل تھا- یہی سبب تھا کہ والدین اور خصوصاً "ماں کے لاڈ پیار کا وہ اکیلا حقدار ٹھہر چکا تھا - گھر ہی سے یہ عادت پکی ہو چکی تھی کہ ہر کھانے والی چیز پر ہاتھ صاف کر دیا کرتا تھا- اسی عادت کو لے کر سکول پہنچا تو بچوں کے بستوں سے پراٹھے اور انڈے غائب ہونے لگے - بریک میں وہ بچوں کے بستوں کی تلاشی لیتا اور وہاں سے کھانے کی جو چیز برآمد ہوتی، اسے اپنی پیٹ کے دوزخ میں جھونک دیتا- یہی وجہ تھی کہ جسمانی ضخامت کے ساتھ ساتھ پیٹ کی وسعت میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا- یاری خان جدید ٹائلٹ سسٹم کے سب سے بڑے ناقد تھے- کہتے تھے یار! اتنے پاکیزہ، نفیس اور سجے سجائے کمرے میں بیٹھ کر گندگی پھیلانے کو دل ہی نہیں مانتا- چنانچہ ٹائلٹ کو یا تو بالکل استعمال نہیں کرتے تھے یا بامر شدید مجبوری استعمال کرنا پڑ جاتا تو جلدی نکل آنے کی کوشش کرتے- عموماً گاؤں سے باہر کھیتوں میں نکل کر کسی بڑے پتھر یا گھنے درخت کے پیچھے بیٹھ کر مسئلہ حل کر لیتے تھے - کہتے تھے بھائی! ہم دیہاتیوں کا بچپن بھی کچھ عجیب سا ہوتا تھا - دس بارہ سال کی عمر تک ہم صرف قمیض پہن کر بغیر شلوار کے گاؤں کی گلی کوچوں میں بڑی آزادی سے دوڑتے بھاگتے رہتے تھے؛ مجال ہے جو کسی کو اعتراض کی جرآت بھی ہوئی ہو- پیٹ اور معدے پر بوجھ بڑھتا تو سیدھے باہر گلی میں جا کر کوڑے کے ڈھیر پر بیٹھ جاتے، جہاں پہلے ہی سے دو تین لڑکے اسی مقصد سے بیٹھے ہوتے اور پیٹ کا بوجھ ہلکا کر لیتے- آپس میں باتیں بھی ہوتیں - اکثر اس وقت ہاتھ میں خشک روٹی یا پراٹھے کا ٹکڑا بھی موجود ہوتا اور کھانے کا شغل بھی ساتھ ساتھ جاری رہتا- یہ وہ زمانہ تھا جب ہم سمجھتے تھے کہ فیصل آباد کا شہر شاہ فیصل نے سعودی عرب سے آ کر آباد کیا تھا، پتہ نہیں اتنے دور سے یہاں آنے کی ضرورت اسے کیوں محسوس

ہوئی - گوجرانوالہ شائد گوجروں کی کوئی آبادی ہوگی اور مردان میں شائد صرف مرد ہی بستے ہوں گے؛ جانے عورتوں کے بغیر مرد کس طرح رہتے ہوں گے- پشاور کے متعلق میرا نظریہ تھا کہ یہاں قصے سنانے والے اور چائے پینے والے لوگ ہی جمع ہونگے (قصہ خوانی بازار کے حوالے سے)-

اچھا ایک اور دلچسپ واقعہ یاد آ گیا- ان دنوں ہم چوتھی یا پانچویں جماعت میں پڑھتے تھے- ہم نئے نئے پاس ہوکر کلاس میں پہنچے تھے- اردو کا پیریڈ جاری تھا اور ہم سب کتابیں کھولے استاد صاحب کی آمد کے منتظر تھے- استادِ محترم ابھی کلاس میں تشریف نہیں لائے تھے- یوں ہی ورق گردانی کرتے ہوئے یاری خان کی نظر "بھونچال" نامی ایک سبق پر پڑی- جانے کیا ہوا، سبق اسے پسند نہ آیا یا نام اسے کچھ مشکل اور عجیب سا لگا کہ اس نے ایک اچھوتا حکم جاری کر دیا - پوری کلاس کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگے، کہ سب لڑکے صفحہ نمبر 23 نکالیں - جب تمام لڑکے صفحہ 23 کھول چکے تو ان کا نادر اور حیرت انگیز حکم آیا- "میں ایک، دو، تین تک گنوں گا؛ سب لڑکوں نے اس ورق کو اپنی کتاب سے پھاڑ کر الگ کرنا ہے؛ اگر کوئی پیچھے رہ گیا تو اس کی خیر نہیں"- اب پوری کلاس میں کس کی اتنی مجال کہ حکم عدولی کرے- جسمانی برتری کے باعث سب ہی اس سے ڈرتے تھے - یاری خان کے "تین" پکارنے سے پہلے ہی ورق کتابوں سے الگ ہو چکا تھا-

جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو چکا- اس واقعے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح آناً" فاناً" پورے سکول میں پھیل گئی- یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی- ہیڈ ماسٹر صاحب نے ہنگامی اجلاس بلایا - ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کیا جائے اور ذمہ دار طلباء کو کس طرح کی عبرت ناک سزا دی جائے - مداوائے الم کا کوئی طریقہ انہیں نہیں سوجھ رہا تھا - واحد ذمہ دار کا تعین نہیں ہو رہا تھا- کوئی بھی لڑکا یاری خان کا نام لینے کی پوزیشن میں نہیں تھا چنانچہ تمام لڑکوں کو سخت اور یادگار سزا دینے کا فیصلہ ہوا- سکول میں موجود دس اساتذہ باری باری کلاس میں آتے اور ہر طالبعلم کو چار زوردار ڈنڈے رسید کر کے نکل جاتے - یہ سلسلہ پورے ایک مہینے تک جاری رہا اور روزانہ کا یہی معمول بن گیا- صبح سویرے سکول میں نئے دن کا آغاز ہماری سزا سے ہوتا - اور ہم یاری خان کی قیادت میں ہنسی خوشی یہ الم سہنے کو تیار ہوتے - "تم اپنی خو نہ بدلو گے، ہم اپنی وضع کیوں بدلیں" کے مصداق ہم اس وقت استقامت کا پہاڑ بن چکے تھے- ان دنوں مزید کتابوں کا بندوبست کرنا آسان کام نہیں تھا - چنانچہ اس سال "بھونچال" نامی سبق کسی نے بھی نہیں پڑھا-

☆☆☆☆☆

قصہ ایک گدھے کی ای میل کا۔۔۔۔(طنز و مزاح)

نوٹ:(کسی بھی قسم کی مماثلت ضرور ہوگی۔۔۔۔مگر۔۔۔۔اتفاقیہ ہوگی، لہٰذا ساڈے ولوں معذرت اے)

سیدہ آمنہ ریاض

رات کے تین بجے میری آنکھ کھل گئی اور نیند نہ آئی تو کتاب لے کر پڑھنے بیٹھ گئی۔ابھی تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ اچانک کسی کی آواز آئی۔ جو سر اٹھا کر دیکھا تو ذرا فاصلے پر ایک گدھا کھڑا تھا۔۔۔۔۔۔۔جی ہاں جیتا جاگتا گدھا۔۔۔۔اس کو اتنا قریب دیکھ کر میں نے اونچی آواز میں چیخیں ماریں اور خوب ماریں۔ گدھے کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔البتہ اس نے یہی کہا" جب آپ چیخیں مار چکیں تو میری ایک عرض سن لیں۔" میں جو کہ ہوش و ہواس کھو ہی بیٹھی تھی ایک گدھے کو اردو بولتا دیکھ کر مزید حیران ہو گئی ابھی کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ گدھا بولا" آپ پوچھنا چاہ رہی ہیں کہ میں اندر کیسے آیا؟ میں اردو کیسے بول رہا ہوں؟ یقین کریں مجھے خود بھی معلوم نہیں ہے۔البتہ ایک ضروری خط لکھوانا ہے آپ سے"

میں نے ماتھے سے پسینہ پونچھا اور بولی "خط کی اہمیت اپنی جگہ لیکن اب تقریباً متروک ہو چکے ہیں" اس پر وہ گدھا بولا

چلیں پھر ای میل ہی کر دیں۔"
میں نے پوچھا " کس کو ای میل کرنی ہے؟ اور اس میں کیا لکھنا ہے؟"
گدھے نے جواب دیا، "حکومت پاکستان کو ای میل کرنی ہے اور یہ لکھنا ہے کہ پاکستان کا قومی جانور مارخور کے بجائے مجھے بنایا جائے"۔
اس جواب پر مجھے تھوڑی ہنسی آئی اور میں نے کہا کہ "میاں! ہو نہ گدھے کے گدھے! ایک تو آدھی رات کو میرے کمرے میں آدھمکے، مجھے خوف زدہ کیا، اور اب ای میل میں یہ لکھوانا چاہتے ہو کہ تمہیں پاکستان کے قومی جانور کا خطاب دیا جائے؟ خود تو تم گدھے ہو ہی مجھے بھی یہی سمجھ رکھا ہے؟"
اس پر گدھا بولا، "جی ہاں! میں یہی چاہتا ہوں کیونکہ مارخور کوئی کام نہیں کرتا۔ ہم ہر جگہ "اِن" ہیں"۔
میں نے کہا، "دیکھو میاں! میرا مزید وقت ضائع مت کرو، جہاں سے آئے ہو چپ چاپ واپس نکل لو۔ ایک گدھے کے لیے میرے پاس وقت نہیں"۔
گدھا بولا، "میں ای میل کروائے بغیر ہرگز نہیں جاؤں گا"۔ اس پر میں نے کہا کہ "پہلے مجھے اس بات پر قائل کرو کہ آخر وہ کون سے عوامل ہیں جن کی بنیاد پر تمہیں پاکستان کا قومی جانور بنایا جائے؟ ای میل تو بعد میں لکھی جائے گی"۔
اس سوال پر گدھے نے مجھ سے سوال کیا، "مجھے پہلے بتائیں کہ پاکستان کے ایوانوں اور پارلیمنٹ ہاؤسز، میں کون براجمان ہیں؟"
میں نے بے ساختہ جواب دیا، "گدھے"
اس نے اگلا سوال کیا، "اگر کوئی لڑکا کسی لڑکی کو سرراہ چھیڑے تو وہ آگے سے کیا کہتی ہے؟"
میں نے جواب دیا، "ابے او گدھے! شرم نہیں آتی؟"
اس نے اگلا سوال داغا، "اگر کوئی بچہ امتحان میں ناکام ہو جائے تو والد محترم کون سا تاریخی جملہ ارشاد فرماتے ہیں؟"
میں نے جھٹ سے جواب دیا، "او کھوتے دیا پترا--- کیتا ای نہ میرا پیسہ برباد"۔
اس پر گدھا صاحب ارشاد فرمانے لگے، "آپ کے سارے جوابات درست ہیں۔ ابھی بھی آپ کو اعتراض ہے کہ ہمیں کوئی قومی خطاب دیا جائے؟"
"مارخور تو بیچارہ اکیلا پہاڑوں پر سڑتا رہتا ہے، اکثر و بیشتر اسی طرح غائب رہتا ہے جیسے میرے سر سے سینگ غائب ہو چکے ہیں، بلکہ بہت سوں کو تو اس بات کا علم ہی نہیں کہ وہ پاکستان کا قومی جانور ہے"۔
میں (جو کہ پہلے سوال کے جواب پر ہی قائل ہو گئی تھی) نے جان کر بیزاری کا اظہار کیا اور کہنے لگی "یہ تو کوئی خاص بات نہیں، ابھی

مزید مثالوں کی ضرورت ہے"۔
اس پر گدھا محترم فرمانے لگے، "دیکھیں محترمہ! سارے شادی شدہ مرد آخر گدھے ہی تو ہیں۔ اگر عقل مند ہوتے تو شادی کرتے؟"
تو پھر غیر شادی شدہ مردوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟" میرا اگلا سوال،
اس پر گدھے نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا، "وہ بھی سب گدھے ہیں، اگر عقل مند ہوتے تو شادی کے بارے میں سوچتے؟"
میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچی تھی کہ گدھے نے کہا، "ماضی میں بہت سی فلمیں بھی ہم گدھوں پر بن چکی ہیں"۔
میں نے اب کہ کہا، "دیکھو بھئی جو باتیں تم بیان کر چکے ہو وہ تو میں ماننے کو تیار ہوں، پر میں نے تو کوئی فلم تمہارے نام کی مناسبت سے آج تک نہیں دیکھی؟"
گدھے نے جھٹ کہا، "لو جی!!! ابھی نام گنوائے دیتا ہوں، ایک نہیں کئی ہیں، "گدھے کا کھڑاک"، "گدھا گجر"، "گدھا ان جنگل"، "بنارسی گدھے"، "اچھے گدھے، برے گدھے" میں بولی، "او بھئی بس کرو جو منہ میں آیا بولتے جا رہے ہو، یہ تو بہت مشہور فلمیں ہیں جن کے ناموں کو تم نے تبدیل کر رکھا ہے"۔
گدھا بولا، "اچھا چلیں میرے بارے میں ایک شاعر کا کہا ہوا مشہور شعر تو سنا ہی ہوگا، "ہر شاخ پہ کھوتا بیٹھا ہے انداز گلستاں کیا ہوگا"
میری ہنسی اس بار قہقہے میں بدل چکی تھی اور میں منہ پر ہاتھ رکھ کر اس کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی، بولی" اب یہ بھی بتا دو کہ گدھا ٹوٹی شاخ پر بیٹھا ہے یا گدھے کے بیٹھنے سے شاخ ٹوٹی ہے؟"
اس سے پہلے کہ وہ گدھا نما شخصیت اس سوال کا جواب دیتی، میں نے جھٹ کہا، "اچھا لکھ دیتی ہوں ای میل ---- پر مجھے اس سے کیا فائدہ حاصل ہوگا؟"
گدھا خوشی خوشی بولا، "او جی میں آپ کو "جٹ" کی "کھوتا کڑاہی" کھلاؤں گا، وہ بھی بالکل فری۔ اس کی خاصیت یہ ہے کہ اس کو کھاتے ہی آپ کسی کو بھی دولتی مار سکتی ہیں"۔
مجھے ابکائی آتی محسوس ہوئی اور میں نے سوچا اس گدھا نما مصیبت سے جان چھڑائی جائے اور جلدی سے ای میل باکس کھولا تا کہ جان خلاصی ہو۔ لیکن جیسے ہی اوپر دیکھا
--- گدھا صاحب غائب --- ایک بار پھر خوف کی لہر دوڑ گئی اور سوچا کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ کیونکہ کسی بھی مافوق الفطرت، ڈراونی اور عجیب الخلقت چیز کی غیر موجودگی ماحول کو مزید پر اسرار بنا دیتی ہے۔ ہر جگہ ڈھونڈا پر وہ کوئی سوئی تو تھا نہیں جو نہ ملتا؟ خیر رات تو جیسے تیسے گزری لیکن میں سوچنے لگی کہ اب کہ کوئی الو پرائیڈ آف پرفارمنس کا دعویدار بن کر نہ آ جائے؟؟؟

☆☆☆☆☆

شاہ داستان

سید شوکت علی شاہ، ضلع اٹک کے دور افتادہ قصبے ٹلہ گنگ میں پیدا ہوئے، پنجاب یونیورسٹی اورنٹل کالج لاہور سے ایم اے سیاسیات اور قانون کی ڈگری لی۔ بعد میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلیز سڈنی آسٹریلیا اور AIT تھائی لینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق صوبائی سول سروس ہے۔

مصطفیٰ زیدی نے کہا "افسروں میں انھیں شاعر سمجھا جاتا ہے اور شاعروں میں افسر گردانا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ افسروں میں انھیں اعلیٰ درجے کا ایڈمنسٹریٹر اور ادیبوں میں صفِ اول کا ادیب جانا جاتا ہے۔

شاہ صاحب پنجاب کے مختلف اضلاع میں دس سال تک ڈپٹی کمشنر رہے۔ کمشنر بہاول پور، ممبر پبلی کیشن سروس کمیشن، ممبر بورڈ آف ریونیو، سیکرٹری انفارمیشن حکومت پنجاب اور چیئرمین لاہور آرٹس کونسل رہے۔

ان کی نو کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ زیرِ طبع کتاب 'شاہ داستان' تجسس اور تحقیق کے کئی در وا کرتی ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اُس کتاب کے مقابلے میں مجھے اپنی سوانحِ عمری Miniature لگتی ہے۔

شوکت علی شاہ

پاکستان زندہ باد: پاکستان بالآخر فائنل میں پہنچ گیا۔ اس روز پاکستان کا مقابلہ جرمنی سے ہونا تھا۔ یہ آخری میچ تھا اس سے پہلے تیسری اور چوتھی پوزیشن کے لئے برطانیہ اور ہالینڈ کے درمیان مقابلہ تھا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ فائنل سب دیکھیں گے اور علی الصبح جا کر میں اور امیر احسان ٹکٹ کا بندوبست کریں گے کیونکہ ہمارے پاس فائنل کے ٹکٹ نہیں تھے۔

امیر احسان صبح سویرے آ گیا۔ چونکہ وہ اپنی کار پر آیا تھا اس لئے سفر جلد کٹ گیا۔ ہم جب گراؤنڈ کے باہر پہنچے تو صبح کے دس بج رہے تھے۔ اندر برطانیہ اور ہالینڈ کا ہاکی میچ ہو رہا تھا۔ ہم گاڑی پارک کر کے آئے تو

کچھ پاکستانیوں نے ہمیں دیکھتے ہی نعرے لگانے شروع کر دیے۔

''ٹکٹ چاہئے؟ کتنے ٹکٹ چاہئیں؟ یہ میچ مس نہ کریں، ملکی وقار کا سوال ہے۔''

پہلے تو ہم بڑے متاثر ہوئے کہ جذبہ حب الوطنی جو اکثر ملک میں سویا رہتا ہے یہاں پر یک دم بیدار ہو گیا ہے۔ ہم نے پانچ ٹکٹوں کی قیمت پوچھی تو وہ بے حیائی سے مسکرائے ''پانچ سو ڈالر''

میں نے سرزنش کی ''آپ ٹکٹ بیچ رہے ہیں یا ملک فروخت کر رہے ہیں اور اگر ملک فروخت کر رہے ہیں تو بہت ارزاں فروختند'' شرمندہ تو انہوں نے کیا ہونا تھا وہ دیگر گاہکوں کی تلاش میں نکل گئے۔

امیر احسان نے کہا ''لے لیں یہ تاریخی میچ ہے۔ اگر نہ دیکھ پائے تو ساری زندگی قلق رہے گا۔''

''فکر نہ کریں۔ اللہ کارساز ہے۔ پاکستانیوں سے بلیک کا ٹکٹ نہیں خریدیں گے۔ اگر انہوں نے کاروبار ہی کرنا ہے تو کسی اور ملک کا ٹکٹ بیچیں''

ہم باتیں کر رہے تھے کہ پہلا میچ ختم ہو گیا۔ ایک بوڑھا برطانوی اپنے سے کہیں زیادہ بوڑھی بیوی کے ساتھ باہر نکلا۔ میں اس کے قریب گیا اور کہا کہ تم نے اپنے ملک کا میچ دیکھ لیا ہے اگر چاہو تو قیمت خرید پر ٹکٹ ہمیں دے دو۔ اس نے کچھ دیر سوچا اور بولا ''مجھے اپنی بیوی سے مشورہ کر لینے دو۔'' دونوں میاں بیوی ایک بروٹا نما درخت کی ہلکی چھاؤں میں چند منٹ تک گٹ مٹ کرتے رہے اور بالآخر بوڑھے جوڑے نے کہا کہ وہ اصل قیمت پر ٹکٹ فروخت کرنے کے لئے تیار ہیں۔ ہم نے تھوڑی سی کوشش کے بعد پانچ ٹکٹ پچاس ڈالر میں خرید لئے۔

اتنے میں افضل حسین، رانا صاحب اور میلہ صاحب بھی آ گئے۔ جب ہم میچ دیکھنے گیٹ کے اندر داخل ہوئے تو ہم نے دیکھا کہ وہی لوگ مایوسی کے عالم میں ٹکٹ اصل قیمت سے بھی کم قیمت پر بیچنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن انہیں کوئی گاہک نہیں مل رہا تھا۔

ہاکی کا فائنل میچ بڑا جاندار تھا۔ کاغذوں میں جرمنی کی ٹیم زیادہ مضبوط تھی لیکن جوش اور جذبہ پاکستانیوں میں زیادہ تھا۔ امریکہ کے کونے کونے سے اہل وطن قومی ٹیم کو داد دینے پہنچے تھے۔ تمام فضا پاکستان زندہ باد اور اللہ اکبر کے نعروں سے گونج رہی تھی۔ اس وقت کوئی سندھی کوئی پنجابی کوئی بلوچی اور کوئی پٹھان نہیں تھا بلکہ سب بھائی بھائی تھے۔ شائقین بینڈ باجے ساتھ لائے تھے۔ کچھ زندہ دل تو ڈھول بھی اُٹھا لائے تھے۔ نفیریاں بج رہی تھیں۔ امریکن اور دیگر یورپین بڑی حیرت سے یہ سب منظر دیکھ رہے تھے۔ دونوں ٹیمیں جی جان سے کھیلیں۔ مقررہ وقت میں میچ برابر رہا۔ مزید وقت دیا گیا۔ نتیجہ وہی رہا۔ پھر آخری موقع دیا گیا۔ دونوں ٹیمیں تھک کر نڈھال

ہو چکی تھیں لیکن گرمی نے جرمنی کی ٹیم کے کس بل نکال دیے۔ قسام ازل نے فتح پاکستان کے مقدر میں لکھی تھی۔ جب آخری وسل بجی تو میدان ایک بار پھر نعرۂ تکبیر اور پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گونج اُٹھا۔ عجیب منظر تھا۔ لوگ ناچ رہے تھے، لوگ گا رہے تھے، لوگ ہنس رہے تھے، لوگ رو رہے تھے، خوشی کے آنسو، دیارِ غیر میں اتنی شاندار فتح! ساری ٹیم سجدے میں گر گئی۔ سارے پاکستانی تماشائی سجدہ ریز ہو گئے۔ ایسٹ ایل اے کالج کا گرؤنڈ عیدگاہ کا منظر پیش کر رہا تھا۔ بغیر واقفیت کے بھی لوگ ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے۔ اگر یہ جذبہ ایک ماہ کے لئے بھی ساری قوم میں بیدار ہو جائے، میں نے سوچا! تو پھر اس قوم کو کوئی شکست نہیں دے سکتا۔ کوئی مات نہیں ہو سکتی۔ تمام سازشیں اور ریشہ دوانیاں روئی کے گالوں کی طرح فضا میں اُڑ جائیں گی۔

جب ہم واپس لوٹے تو وقتی طور پر ہی سہی کتھارسس ہو چکا تھا۔ روح کی ساری کثافت دھل چکی تھی۔ ایک عجیب طرح کی بالیدگی کا احساس۔ افضل حسین، رانا صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگے "جہاں ہم لوگوں کو مسرت ہو رہی ہے وہاں سٹیڈیم کے قریب کھڑی ہوئی کئی حسیناؤں کو آپ کی عدم موجودگی کی وجہ سے بڑی مایوسی ہوئی ہوگی۔" وہ مسکرا کر بولے "ہر پاکستانی کو اپنے اپنے رنگ میں ملک و قوم کا نام روشن کرنا چاہئے۔ امیج بلڈنگ صرف کھیل کے میدان میں ہی نہیں ہوتی اور بھی میدان ہیں۔"

لاس ویگاس: اولمپکس ختم ہوئے تو رانا صاحب اور ملک خدا بخش سان فرانسسکو چلے گئے۔ بھائی افضل حسین کہنے لگے "چلو کوئے ندامت میں چلتے ہیں۔" میں نے حیرت کا اظہار کیا تو کہا "میری مراد لاس ویگاس ہے۔" میں ان کی افتادِ طبع سے واقف تھا لندن سے زخمی ہو کر آئے تھے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ جیب کا صنم کدہ ویران کر بیٹھیں۔ جب ان کا اصرار تکرار کی حد تک بڑھا تو ان کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دئے۔

جب ہم لاس ویگاس پہنچے تو سورج غروب ہو چکا تھا۔ ہم ایم جی ایم گرینڈ میں ٹھہرے۔ میٹرو گولڈن میئر کمپنی کا یہ کیسینو دنیا کا سب سے بڑا ہوٹل ہے۔ 5200 کمروں پر مشتمل یہ عمارت فن تعمیر کا شاہکار ہے۔ اس کے مرکزی ہال میں ہزاروں آدمی سما سکتے ہیں۔ لاتعداد ریسٹورنٹ، بارز، کنسرٹ ہال، تھیٹر، شاپس کو دیکھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے۔ دنیا کی ہر چیز یہاں میسر ہے۔ لاس ویگاس بلیوارڈ میلوں تک پھیلا ہوا ہے۔ رنگا رنگ روشنیوں نے اس کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ سڑک کے دونوں جانب بے شمار کیسینوئیں۔ یہ دنیا کا واحد شہر ہے جس کے ساتھ لوگوں نے Love- hate تعلق قائم کر رکھا ہے۔ اس جیسا شہر دُنیا میں اور کہیں نہیں ہے۔ لوگ محبت اس لئے کرتے

ہیں کہ یہ خوابوں کی سرزمین ہے۔ تعیش کی آخری حدوں کو چھوتا ہوا رند خرابات اور نفرت اس وجہ سے کہ اسے شہر گناہ بھی تصور کیا جاتا ہے جہاں جوا کھیلنے کا انتظام، غسل خانوں اور ریستورانوں تک ہو، جہاں مئے ناب خاص و عام میں بٹتی ہو، جہاں ہر جگہ بنت حوا، ہیلو ہیلو کرتی سنائی دے وہاں رقص ابلیس نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا؟

اسے دیکھ کر تجسس و تحقیق کے در خود بخود کھلنا شروع ہو جاتے ہیں۔

نیواڈا کے صحرائے بے نوا میں یہ شہر صدادا کیسے آباد ہوا؟ عناصر کو کیونکر شکست ہوئی؟ بنجر زمین کا کچھ حصہ کیسے گل و گلزار ہو گیا؟ نیو اڈا کی تاریخ حیرت و دلچسپی کے کئی در وا کرتی ہے۔ اس کی ترقی کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۵۰ میں اس کی آبادی ایک لاکھ ساٹھ ہزار کے لگ بھگ تھی۔ اب صرف لاس ویگاس اور رینو میں اس قدر ٹورسٹ ہر روز آتے ہیں۔ اس وقت اس کی آبادی سب امریکی ریاستوں سے کم تھی۔ اس کے دارالحکومت کارسن سٹی میں کل تین ہزار انسان بستے تھے اور یہ شہر شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جاتا تھا۔ ساری ریاست چار چیزوں پر زندہ تھی۔ کان کنی، مویشیوں کے ریوڑ، جواء اور طلاق۔ ایک تو ریاست غریب، پھر کیلیفورنیا جیسی امیر اور رنگین ریاست کے سائے تلے، اس کا احساسِ کمتری بڑھتا گیا لیکن اس نے ہمت نہ ہاری اور اہل ریاست نے فیصلہ کیا کہ ان چیزوں کی طرف توجہ دی جائے جو دیگر ریاستوں میں مفقود ہیں یا جن کی قانونی ضابطوں کی وجہ سے حوصلہ افزائی نہیں ہوتی۔

اس کا پہلا مسئلہ تو یونین کے ساتھ انضمام تھا۔ اس کی غربت اس کے پاؤں کی زنجیر بنی ہوئی تھی - ۱۸۶۴ء تک یہ صرف Territory تھی اور امریکہ اس کو ساتھی بنانے میں ہچکچا رہا تھا لیکن اچانک ہی حالات نے پلٹا کھایا۔ ابراہیم لنکن کی نظریں اس کھوٹے سکے پر پڑیں جو اسے وقتی طور پر ہی سہی، بڑا کارآمد نظر آیا۔ وہ تاریخ کی دہلیز پر کھڑا تھا اور غلامی کی لعنت ہمیشہ کے لئے ختم کرنا چاہتا تھا۔ تیرہویں ترمیم کے لئے اسے ایک ریاست کے ووٹ کی ضروری تھی۔ اس طرح ایک بے نوا کو نوا ملی۔ نیواڈا کو کہا گیا کہ وہ اپنا آئین تار کے ذریعے واشنگٹن بھیجیں۔ آئین کا مسودہ بھیجنے کے لئے رقم کی ضرورت تھی۔ تین ہزار ڈالر ریاست کے خزانے میں نہ تھے۔ اس کا انتظام بھی لنکن کو کرنا پڑا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ابدیت کے مقام تک پہنچنے کے لئے صرف چند لفظوں کا فاصلہ تھا۔ ادھر آئین کی کاپی واشنگٹن پہنچی اور ادھر اسے ریاست کا درجہ مل گیا۔ اس طرح یہ رقبے کے لحاظ سے چھٹی بڑی ریاست بن گئی۔ ان کی تنگ دستی کا یہ عالم تھا کہ بھیڑوں اور مویشیوں کے قاتل

Coytes کا خاتمہ بھی نہ کر سکتے تھے۔

جن دو چیزوں کی وجہ سے نیواڈا مشہور ہوا اور اہل امریکہ کی توجہ کا مرکز بنا وہ طلاق اور گیمبلنگ تھیں۔ طلاق کے حوالے سے منفعت کے علاوہ اہل نیواڈا کا نکتہ نظر یہ تھا کہ اگر دو شخص کسی وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ نہیں رہنا چاہتے تو انہیں موقع دینا چاہئے کہ الگ ہو کر ایک نئی زندگی کا آغاز کر سکیں۔ اس کے لئے پہلے نیواڈا میں چھ ماہ کی رہائش ضروری تھی جو بالآخر چھ ہفتے کر دی گئی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ نیواڈا کی اکثریت رومن کیتھولک تھی اور وہ مذہبی ضابطوں کی وجہ سے طلاق کے خلاف تھے۔ اس لئے جتنی بھی طلاقیں ہوئیں وہ باہر سے آئے ہوئے لوگوں کی تھیں۔ اب طلاق باقاعدہ ایک ٹریڈ بن چکی ہے اور دو شہر رینو اور ویگاس ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لئے بے قرار ہیں۔ لاس ویگاس کا پلہ بھاری نظر آتا ہے۔ رینو بیچارے نے کیا مقابلہ کرنا ہے۔ بڑے بڑے جغادری شہر اس کے آگے ہاتھ جوڑتے نظر آتے ہیں۔

لیکن جس چیز نے نیواڈا کو دنیا میں مشہور کیا ہے وہ گیمبلنگ ہے۔ اتفاق سے اس کی بدنامی کی وجہ بھی یہی ہے۔ لاس ویگاس کا نام سنتے ہی زاہدان خشک، لاحول کا ورد شروع کر دیتے ہیں اور وہ جو اتنے زیادہ خشک نہیں ہوتے ان کے چہرے کھل اُٹھتے ہیں اور سارے وجود میں گدگدیاں سی ہونے لگتی ہیں۔ اسے بیک وقت شہر گناہ اور شہر بے پروا کہا جاتا ہے۔ نیواڈا کو ریاست کا درجہ ملتے ہی جوئے کو قانونی تحفظ مل گیا۔ اس پر مذہبی گروہ نے بڑا احتجاج کیا کہ اس لعنت کو ریاست بدر کیا جائے۔ بالآخر ریاست نے ہتھیار ڈال دیے اور ۱۹۱۰ء میں قمار بازی ممنوع قرار دے دی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر طرف غیر قانونی جُوا خانے کھل گئے۔ بدمعاشوں، دلالوں اور گینگسٹرز کی چاندی ہو گئی اور اس کے رسیا لوگوں کو دن دہاڑے لوٹنے لگے۔ دراصل کان کنی کے علاقے سے جُوا ختم کرنا ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص بالٹی لے کر یہ کہے کہ دریائے مسس پی کا پانی خشک کر دے گا۔ چنانچہ ۱۹۳۱ء میں پھر سے اسے قانونی تحفظ مل گیا۔ اس طرح نہ صرف غیر قانونی اڈے بند ہو گئے بلکہ ریاست کو معقول آمدنی بھی ہونے لگی۔

ان پچاس برسوں میں ایک معاشی انقلاب آ گیا ہے۔ ساری دنیا کی فالتو دولت و یگاس پہنچ جاتی ہے۔ ایک بلین ڈالر سے کم قیمت پر اچھا کیسینو نہیں بنتا۔ مقابلہ اس قدر سخت ہے کہ چند ایک کو چھوڑ کر تیس سال پہلے بنے ہوئے کیسینو متروک ہو گئے ہیں۔ اُن کو گرا کر نئے بنائے جا رہے ہیں یا پھر پرانوں کی تزئین و آرائش اس طرح کی جا رہی ہے کہ بالکل نئے پن کا گمان ہوتا ہے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش میں یہ لوگ آگے ہی آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔ جو

لوگ دنیا کے Seven wonders کی باتیں کرتے ہیں وہ جلد ہی یہاں کے Heaven Wonders کے گیت گائیں گے۔

شہر کی رونق اور رعنائیوں کا یہ عالم ہے کہ ۱۹۵۱ء کا ایٹمی دھماکہ بھی لوگوں میں خوف و ہراس نہ پیدا کر سکا۔ ویگاس سے صرف ستر میل کے فاصلے پر اٹامک انرجی کمیشن نے پانچ دھماکے کیے، وہ اس قدر شدید تھے کہ پانچ لاکھ مربع میل کے علاقے میں ان کی روشنی دیکھی گئی۔ تین سو میل دور لاس اینجلس کی دھند ختم ہو گئی اور مبینہ طور پر Radio Active snow نیویارک جا گری۔

چند جگہوں کو چھوڑ کر ریاست کی ساری زمین بے آب و گیاہ اور بنجر ہے۔ صحرا میں سفر کرتے ہوئے ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے آدمی چاند پر اُتر گیا ہو۔ ڈیزرٹ صحرائے نجد کی طرح نہیں ہے۔ زمین نیم سخت ہے جس پر جگہ جگہ چھوٹی جھاڑیاں اُگی ہوئی ہیں۔ پانی کی قلت نے ریاست کو انوکھا طریقہ اپنانے پر مجبور کر دیا ہے۔ ہوائی جہاز کے ذریعے ان بادلوں پر دوائی چھڑکی گئی جو بن برسے گزر جاتے تھے۔ اس پر ریاست یوٹا (Utah) نے ۱۹۴۸ء میں ایک طوفان کھڑا کر دیا کہ ان کے بادلوں کو زبردستی برسنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ یوٹا کا استدلال یہ تھا بادل حسب دستور گرجیں تو نیواڈا پر لیکن برسیں اس کی سرزمین پر۔ نیواڈا کا موقف تھا کہ ابر کرم سب کے لئے ہوتا ہے اور رینو میں واحد 'اسکینگ ریزارٹ' کے لئے برف کی ضرورت صرف اسی طریقے سے پوری کی جا سکتی ہے۔ دو ریاستوں کے اس باہمی جھگڑے سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے نیواڈا کے ایک زمیندار نے مقامی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا کہ جو بادل اس کی جاگیر پر سے گزرتے ہیں ان کے پانی پر صرف اس کا حق ہے۔ لہٰذا ریاست کو روکا جائے کہ اس پانی سے استفادہ نہ کرے۔ یہ غالباً دنیا کا پہلا مقدمہ تھا جس کی بنیاد اُڑتے ہوئے آوارہ بادلوں کو بنایا گیا تھا۔

اسے اتفاق کہئے کہ یہاں بھی ہم ایم جی ایم کے مہمان تھے۔ رؤف احمد تارڑ نے مفت ٹھہرنے کا بندوبست کیا تھا اور وہ بھی ڈی لکس سویٹ میں۔ دو بیڈ روم اور درمیان میں مناسب سائز کا ڈرائنگ روم تھا۔ ہوٹل کے منیجر نے اس پر اکتفا نہ کیا تھا بلکہ حق مہمان نوازی پوری طرح ادا کیا تھا۔ میز پر فروٹ باسکٹ، شو کے دو ٹکٹ اور شیواس ریگل کی ایک عدد شوخ و شنگ بوتل۔ انہیں اس سے غرض نہیں ہوتی کہ کوئی پیتا ہے یا نہیں۔

میں نے افضل حسین کو مشورہ دیا کہ کھیل کے لئے کئی دن پڑے ہیں، کیوں نہ شو دیکھا جائے۔ ہالی وڈ سے رقاصاؤں کا ایک خاص طائفہ آیا تھا۔ کہنے لگے "اگر ناچ ہی دیکھنا ہے تو اس کے لئے لاہور کا وہ بازار موزوں ترین جگہ ہے کون سا روز روز ویگس آنا ہوتا

ہے۔ Let us make head against the wall"

چونکہ میرا دیوار سے سر ٹکرانے کا کوئی ارادہ نہ تھا اس لیے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ جب مرکزی ہال میں آیا تو رونق اپنے عروج پر تھی ۔ میکدے آباد تھے ۔ ریستورانوں میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی اور گیمبلرز دنیا و مافیہا سے بے خبر تاش کی بازیاں لگانے میں مصروف تھے۔ چلتے چلتے میں تھیم پارک میں آ گیا۔ کیسینو کی مرکزی عمارت سے ملحق اس پارک میں لعل ڈزنی آباد ہے۔ جو لوگ بچوں کے ساتھ آتے ہیں وہ ان کے لئے بہترین تفریح گاہ ہے۔ ہر قسم کی رائیڈز، جھولے اور دائروں میں گھومنے والی ٹرینیں ہیں ۔ ساتھ ہی وہ سٹیڈیم ہے جہاں باکسنگ کے میچ ہوتے ہیں۔ نامور باکسر محمد علی نے اپنی عالمی شہرت کا آغاز یہیں سے کیا۔ اس کے مشہور الفاظ I will dance like a buttrfly and sting like a bee. اسی سٹیڈیم سے بلند ہوئے۔ جب اس کا مقابلہ سونی لسٹن سے ہوا تو نقادوں اور تبصرہ نگاروں نے خوف اور حیرت سے اپنی انگلیاں منہ میں ڈال لیں۔ ان کا خیال تھا کہ راجرس کے چاقو کو قصاب کے بغدے سے لڑا دیا گیا ہے۔ ممولہ شہباز سے پنجہ آزمائی کرنے آیا ہے ۔ ایک میگزین نے طنزاً لکھا A clown prince enters into the tiger's cage جب لسٹن اس کے تابڑ توڑ حملوں کی تاب نہ لا کر چاروں شانے چت گرا تو کیسیس کلے چرچ سے نکل کر مسجد میں داخل ہو گیا۔ اہل مغرب کی نظروں میں کریلا نیم چڑھ گیا تھا۔ ایک کالا پھر مسلمان......!

جب کیسینو سے باہر نکلا تو حد نگاہ تک روشنیوں کے مینار نظر آئے، اس وقت تک لگژر ایکس کیلی بار۔ مراج ٹرائیر آئی لینڈ اور بلیجیو نہیں بنے تھے۔ بلیجیو کی جگہ ہلٹن فلیمنگو کھڑا تھا۔

کسی زمانے میں ہلٹن فلیمنگو کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ ۱۹۴۶ء میں نیویارک کے بدنام زمانہ بینجمن ویگاس نے اسے بنایا۔ اس وقت یہ امریکہ کا سب سے بڑا کیسینو تھا۔ ہر چند کہ مخالف گروپ نے اسے قتل کر دیا لیکن وہ اس شہر کو رنگ اور روپ دے گیا۔ اس کے گیمبلنگ ٹیبلز اور خاص طور پر بوفے ڈنر مشہور تھے لیکن یہ بالآخر زمانے کی رفتار کا ساتھ نہ دے سکا۔ اس کے مقابلے میں بڑے بڑے اور نہایت خوبصورت کیسینو بن گئے اور یہ بیچارہ اپنی قدامت پسندی کے زعم میں مارا گیا۔ فی زمانہ اولڈ گولڈ نہیں ہوتا Antique ہوتا ہے جس کی قدر صرف خواص کرتے ہیں۔ سونے پر ہر کوئی مرمٹتا ہے۔ جس طرح فیشن بدل جاتے ہیں، ملبوسات کے نئے سے نئے ڈیزائن بنتے ہیں، گاڑیوں کے نئے ماڈل آ جاتے

ہیں اسی طرح فن تعمیر بھی کروٹیں بدلتا ہے۔ جس تیزی سے ٹیکنالوجی ترقی کر رہی ہے اور جو نہ ختم ہونے والی مقابلے کی دوڑ ویگاس میں شروع ہو چکی ہے اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ہر دس سال بعد کیسینوز کو ڈھا کر نئے عجوبے کھڑے کرنے ہوں گے یا پھر ان میں کافی ردوبدل کرنا ہوگا۔ ویسے تو سارے امریکہ میں کٹ تھروٹ کمپیٹیشن ہے۔ ہوائی کمپنیاں، ہوٹل، فیکٹریاں اور کارخانے یوں صفحہ ہستی سے مٹ جاتے ہیں جیسے کبھی بنے ہی نہ تھے لیکن ویگاس کے Cuts کچھ زیادہ ہی گہرے ہوتے ہیں۔ ایک دفعہ چرکہ لگ جائے تو پھر گردن سلامت نہیں رہتی۔

چلتے چلتے میں سیزر پیلس کے مرکزی دروازے پر پہنچ گیا۔ جب کمپاؤنڈ میں داخل ہوا تو ایسے محسوس ہوا جیسے روم کی عظمت گم گشتہ کو بلآخر تلاش کر لیا گیا ہے۔ جیسے روم کی تاریخ اور جغرافیہ ساتھ ساتھ چل رہے ہوں۔ وسیع و عریض لان، سنگ مرمر سے تراشے ہوئے دیوتاؤں کے مجسمے، جولیس سیزر اپنے جرنیلوں کے جلو میں دربار سجائے ہوئے۔ وہ دست راست جو بعد میں دست درازی پر اُتر آئے تھے۔ کرسٹل سے بنے ہوئے فوارے، خودکار ایکسیلیٹر - مارک اینٹونی، سینٹ کے باہر اپنی شہرہ آفاق تقریر کے تانے بانے بنتا ہوا۔ اگر ایم جی ایم گرینڈ لاس ویگاس کی عظمت کا علمبردار ہے تو سیزر پیلس، اس کی جمالیاتی حسوں کا پیغامبر۔ اس سے قیمتی عمارتیں تو شاید کئی ہوں اس جیسا حسن کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ بالفرض جولیس سیزر اپنے اس محل کو دیکھ لیتا تو مستی کے عالم میں روم کی حکمرانی چھوڑ دیتا یا پھر ترنگ میں آ کر امریکہ پر حملہ کر دیتا۔ سیزر جو اپنے وقت کا عظیم جرنیل تھا، جو روم کی عظمت اور طاقت کا مظہر تھا، جس نے اپنی فتوحات سے تاریخ کے سینے پر انمٹ نقوش چھوڑے اور یورپی تہذیب کو کئی طریقوں سے متاثر کیا اس نے اپنے حریف پومپی Pompey کے حلیف شاہ Pharnaceso کو ایشیائے کوچک میں شکست فاش دے کر جو الفاظ کہے وہ آج ضرب المثل بن چکے ہیں۔ —— Veni Vici ----- Vidi میں آیا، میں نے دیکھا اور فتح کر لیا۔ وہ روم کی طاقت کو شمال مغرب تک لے گیا۔ جرمنی کو شکست فاش دی، برطانیہ کے دانت کھٹے کئے۔ مصر و شام کو سرنگوں کیا۔ افریقہ نے اس کے قدموں کی چاپ سنی اور اس طرح ایک ایسی مضبوط بنیاد فراہم کی جو بعد میں رومن ایمپائر کے قیام کا سبب بنی اور اس کا بھتیجا آگسٹس Augustus روم کا شہنشاہ بنا۔

کیسینو میں داخل ہونے کے کئی راستے ہیں۔ بلند اور عالی شان ستونوں پر کھڑی ہوئی عمارت اپنے آپ پر ناز کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ جس معمار نے اسے بنایا ہوگا اُس نے

تاج محل ضرور دیکھا ہوگا۔ وہ تاج محل تو نہ بنا سکا لیکن محلوں کا تاج اس کے سر پر رکھ دیا۔ محل بنانے کے لئے صرف زر کثیر ہی درکار نہیں ہوتا آرکیٹیکٹ کو اپنی تمام تر جمالیاتی حسوں کو بھی بروئے کار لانا پڑتا ہے۔ دماغ کے ساتھ دل کا ہر در وا کرنا پڑتا ہے اور اس میں خون جگر کی آمیزش بھی شامل ہوتی ہے تب جا کر شاہکار بنتے ہیں۔ ساحر لدھیانوی نے تاج محل کی تعمیر کا بے جا گلہ کیا تھا۔

تاج بنانے والوں کے پیاروں کے مقابر بے نام و نمود رہے ہوں یا نہ رہے ہوں لیکن فی زمانہ محلات بنانے والے خود حسینوں کی آنکھ کے تارے بن جاتے ہیں اور محلات پر خرچ ہونے والی رقم کا ایک معقول حصہ ان کی جیب میں چلا جاتا ہے۔

رات کے دو بجے تھے لیکن لوگوں کا اژدہام سڑک کے دو رویہ چل رہا تھا۔ اکثر شہر دن کو جاگتے اور رات کو سوتے ہیں۔ کچھ رات کی رنگینیوں میں کھو کر دن کو آرام کرتے ہیں۔ ویگس ایک ایسا شہر ہے جو کبھی نہیں سوتا۔ لوگ یہاں سونے نہیں آتے۔ شہر کے سونا چاندی کو لوٹنے کی تمنائیں لے کر داخل ہوتے ہیں۔

میں ہوٹل پہنچا تو خاصا تھک چکا تھا۔ چلتے چلتے احساس ہی نہ ہوا کہ سات میل کا فاصلہ طے کیا ہے۔ افضل حسین ہنوز واپس نہ آئے تھے۔ میں اپنے کمرے میں جا کر سو گیا۔

صبح دس بجے میں گہری نیند سے بیدار ہوا۔ کوئی شخص دروازے پر مسلسل دستک دے رہا تھا۔ دروازہ کھولا تو بھائی افضل حسین کھڑے تھے۔ دروازے پر دستک ہاتھ کی بجائے نکل سے دے رہے تھے۔ ساری رات جاگنے سے چہرہ ستا ہوا اور آنکھیں سرخ تھیں۔ خیریت تو ہے؟ مجھے تشویش لاحق ہوئی "بس یہی رہ گیا ہے" انہوں نے نکل کو میری ہتھیلی پر رکھ دیا۔ "باقی سب خیریت ہے"

اس کے بعد ہمارے درمیان کیا بات چیت ہوئی اس کے بیان نہ کرنے میں کئی مصلحتیں کارفرما ہیں۔ ایک تو ہونی کو کوئی ٹال نہیں سکتا دوسرا عادت آسانی سے جاتی نہیں۔ لندن سے زخمی ہو کر آئے تھے یہاں گھائل ہو گئے۔ اگر میں تاریخ کا طالب علم نہ ہوتا تو شاید مجھے حیرانی ہوتی۔ اس کام میں سلطنتیں غرق ہو گئیں یہ تو حافظ آباد کے ایک زمیندار کی معمولی ہار تھی۔

ہم نے باقی تین دن سیر و تفریح میں گزارے۔ افضل حسین کی جیب جواب دے گئی تھی اور میری ہمت۔ دیدہ عبرت نگاہ نے طواف کوئے ملامت نہ کرنے دیا۔ ہم نے ویگس کا سارا شہر چھان مارا۔ پکنک کے لئے ہوور ڈیم بھی گئے۔ یہ لاس ویگس کی لائف لائین ہے۔ کولوراڈو دریا کو پچکار کے اور رام کر کے یہ ڈیم بنایا گیا ہے ڈیم کے ایک جانب ایری زونا ہے اور دوسری جانب نیواڈا۔ پانی کے علاوہ اس سے بجلی بھی پیدا کی جاتی ہے۔ دریاؤں کو نکیل ڈالنے کا یہ مؤثر طریقہ ہے۔ اس طرح ان کا پانی کناروں سے چھلکتا ہے اور نہ جل دے کر سمندر میں جا گرتا ہے۔

[جاری ہے۔]

تلخ و شیریں

شاعری اور شاعروں کی دنیا بڑی دلچسپ اور عجیب دنیا ہے۔ شاعر خود تو بڑے پُرامن لوگ ہوتے ہیں آپس میں نہیں لڑتے لیکن ان کے شعر اور غزلیں آپس میں لڑ جاتی ہیں اس لڑائی میں کمزور شعر اور غزلیں زخمی بھی ہو جاتی ہیں۔ 'بیاض' اگست 2020 میں 'بیاض' کے ایک قلمی معاون شاعر کی ایک غزل خالد احمد کی غزل سے پوری طرح گتھم گتھا ہوگئی اور نتیجے میں بری طرح زخمی بھی:

آنکھیں ہونٹوں کے تالے بھی کھلتے دیکھیں گی
دنیا چھین تو لے گویائی ہم مجبوروں سے
آنکھیں ہونٹوں کے تالے بھی کھلتے دیکھیں گی
دنیا چھین تو لے گویائی ہم مجبوروں☆ کی

.....

دوسری غزل میں آخری شعر میں صرف ردیف زخمی ہوئی ہے۔ اگر کسی شاعر کو کسی دوسرے شاعر کا شعر کچھ زیادہ ہی اچھا لگ جائے تو ویسا ہی شعر کہنے کی کوشش کرتا ہے، نہ کہہ پائے تو وہی شعر کہہ دیتا ہے اور اگر پوری غزل اچھی لگ جائے تو وہی کہہ دیتا ہے۔ کس شعر یا غزل کا اصل خالق و مالک کون ہے اس کا فیصلہ صرف اس بات سے ممکن ہے کہ کس کی غزل پہلے شائع ہوئی۔ حالانکہ اسلوب بیان بھی فیصلہ کن ثابت ہو سکتا ہے لیکن یہ ثبوت بحث طلب ہے۔ اگر دو شاعروں میں زبانوں اور زمانوں کا اختلاف ہو تو کام اور بھی آسان ہو جاتا ہے اور چوری پکڑنی مشکل ہو جاتی ہے۔

اردو شاعری فارسی شاعری کی بغل بچہ شاعری چلی آئی ہے۔ مقامی جغرافیہ، تاریخ، روایات بدیسی اور بدیسی جغرافیہ، تاریخ و روایات دیسی سمجھی گئی ہیں حتیٰ Fauna اور Flora تک امپورٹڈ ہیں۔ مقامی پھول پودے درخت اور پرندے شعر بدر ہی رہے۔ کسی شاعر کو استثنا حاصل ہے تو وہ نظیر اکبر آبادی ہے جس کا مقلد کوئی نہیں نہ اس کی زبان شعر نے رواج پایا۔ شاعری وہی شاعری کہلائی جو فارسی شاعری کی سی ہو۔ زمانوں اور زبانوں کے اختلاف نے اردو شعرا کے لیے فارسی شعرا کے مال کو لے اُڑانا اور بھی آسان کر دیا۔ فارسی شاعری کا 'رنگ' (شاعروں کی اصطلاح) اردو شاعری پر اور فارسی شعرا کا رنگ اردو شعرا پر

محمد ارشاد

☆ پہلے چار شعروں میں ردیف 'ہم مجبوروں سے' ہے اور پانچویں شعر میں 'ہم مجبوروں کی' ہو گیا ہے۔

اس حد تک چڑھ گیا کہ لفظیات تک ناگزیر ٹھہریں۔ فیض تک بچ نہ پائے۔

شیخ صاحب سے رسم و راہ نہ کی
شکر ہے زندگی تباہ نہ کی

.....

ندیم کافی حد تک بچ پائے۔ عام مذاق کو زیادہ درخود اعتنا نہیں سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ بحیثیت غزل گو فیض کو ندیم سے زیادہ مقبولیت حاصل رہی۔ مقام شکر ہے کہ آج کے شعرا اپنے ذاتی مشاہدات و واردات کو موضوع شعر بنا رہے ہیں اور کئی اپنی انفرادیت قائم کر چکے ہیں۔ خالد احمد بھی انہی میں سے ایک ہے۔

خالد نسلاً پٹھان ہے۔ اجداد میں سے کوئی پختونخوا سے، کشادگیٔ رزق کی خاطر یا قتل مقاتلے سے بچ کر پُرامن زندگی گزارنے کی خاطر لکھنؤ گیا اور اسی کو وطن بنالیا۔

گرد رہ غربت چہ قدر سعی وفا داشت
افشاند بہ سر خاک بحدے کہ وطن شد

.....

تقسیم کے بعد پورا خاندان لاہور آ گیا اور مہاجرین بن کر نہیں لاہوری بن کر رہا۔ نیاز فتحپوری، جوش ملیح آبادی، محمود شیرانی کے اجداد بھی پختونخوا سے گئے اور جہاں گئے، وہیں کے ہو گئے لیکن غصے کی وہ کیفیت جو کسی چیلنج کے ردعمل کے نتیجے میں پختون پر طاری ہوتی ہے، ان کے مزاج میں شامل رہی۔ معلوم نہیں یہ لاہوری کا کمال ہے کہ ہر کہ درکانِ نمک رفت نمک شد یا ماحول سے مطابقت کی صلاحیتِ خالد کا کمال کہ لاہوریوں سے بڑھ کر زندہ دلی کے ساتھ جیا۔ زندہ دلی کے ساتھ جینا ہی پورے طور پر جینا ہے۔

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

.....

خالد غصہ کھانے کے بجائے غصہ دلانے والی بات کا ایسا جواب دیتا کہ غصہ دلانے والے کو سوا شرمندگی اور خفت کے کچھ حاصل نہ ہوتا۔

صوبہ پنجاب میں بولی جانے والی سرائیکی☆ ہو یا پنجابی، اردو کے مقابلے میں نہ صرف زیادہ ذخیرۂ الفاظ رکھتی ہیں بعض آوازیں بھی زیادہ ہیں (میں سندھی سے آگاہ نہیں نہ بلوچی سے اس لیے ان کا ذکر نہیں کر رہا)۔ ان زبانوں کی شاعری میں جو وسعت اور گہرائی ہے اردو شاعری فارسی کی بیساکھیوں کے باوصف ان کے مقابلے میں کھڑی نہیں کی جا سکتی۔ خالد نے پنجابی کے سنگار رس کو پورے طور پر جذب کر رکھا تھا اور اردو شاعری کو ایک نئی جہت سے آشنا کیا۔ اس کی نظم مادھول لال حسین اس نئی جہت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ مادھولال حسین

☆ اردو والے کلچر کا ترجمہ ثقافت کرتے ہیں جو عربی لفظ ہے۔ ایک غیر مانوس لفظ کا ترجمہ غیر مانوس لفظ۔ سرائیکی کا لفظ وسیب وہی مفہوم رکھتا ہے جو کلچر کا ہے۔

کی شاعری عارفانہ شاعری ہے، بلھے شاہ، وارث شاہ، بابا فرید وغیرہ کی شاعری کی طرح اور اس شاعری کے مقابلے میں میر درد، بیدم وارثی اور اصغر گونڈوی کا دامن شاعری تنگ ہے۔ اصغر کے اس شعر کی میں نے بہت تعریف پڑھی:

آلام روزگار کو آساں بنا لیا
جو غم دیا اسے غم جاناں بنا لیا

.....

تعریف کرنے والے کو (نام یاد نہیں آ رہا) معلوم نہیں تھا کہ اصغر کا یہ شعر چربہ ہے عرفی کے اس شعر کا:

در دلِ ما غمِ دنیا غمِ معشوق شود
بادہ گر خام بود پختہ کند شیشۂ ما

.....

احمد ندیم قاسمی خالد کے تصوف کی طرف میلان پر تشویش کا اظہار کر چکے تھے کہ ہیں تصوف برائے شعر گفتن خوب است کا شکار ہوکر دوسروں کے چبائے ہوئے نوالے نہ چبانے لگے۔ خالد نے اپنی انفرادیت اور امتیاز پر کوئی آنچ آنے دیے بغیر دو شاہکار نظمیں اردو کے دامن میں ڈال دیں جن میں سے ایک تو وہی مادھول لال حسین والی ہے اور دوسری رحمان بابا پر۔ جناب علی عباس جلالپوری نے 'اقبال کا علم الکلام' میں عطیہ بیگم فیضی کی کتاب 'اقبال' سے نقل کیا ہے کہ قیام یورپ کے دنوں میں اقبال نے کہا کہ جب مجھ پر شعر گوئی کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو ''حافظ شیرازی کی روح میرے اندر حلول کر جاتی ہے اور میری شخصیت حافظ شیرازی میں کھو جاتی ہے اور میں خود حافظ شیرازی بن جاتا ہوں۔'' اقبال حافظ کے پیام کے منکر تھے کلام کے نہیں۔ اقبال کے کلام میں بھی وہی سحر و سرمستی اور رعنائی ہے جو حافظ کے کلام میں ہے۔ عرفی قصیدہ نگاری میں انوری اور خاقانی کا ہمسر تھا۔ قصیدہ نگاری میں بھی اپنی خودداری کو ملحوظ رکھا۔ بڑا خود پسند اور خودستا شاعر تھا۔ اپنی خود داری، خود پسندی اور خودستائی سے صرف تین موقعوں پر دستبردار ہوا، ایک مدح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وقت، دوسرے حضرت علیؓ کی مدح کے وقت اور تیسرے حافظ شیرازی کی شاعری کے آگے اپنی شاعری کو ہیچ ٹھہراتے ہوئے، اپنی شاعری کو تربت حافظ کا طواف کرواتے ہوئے:

بگرد تربتِ حافظ کہ کعبۂ سخن است
برآمدیم بعزم طواف در پرواز

.....

عرفی تو خیر شیرازی تھا، گوئٹے بھی حافظ کی شاعری کو بحر بیکراں اور اپنے آپ کو مٹھی مٹی ناؤ قرار دیتا ہے اور حافظ سے برابری کو پاگل پن۔ رابندر ناتھ ٹیگور کا باپ حافظ کے عقیدت مندوں میں شامل تھا ہی خود رابندر ناتھ ٹیگور بھی کچھ وقت حافظ کے مزار پر ''اعتکاف'' میں بیٹھا رہا۔ سچ کہا آذری

اصفہانی نے:

اگرچہ شاعرانِ نغز گفتار
زیک جام اند در بزم سخن مست
ولے با بادۂ بعضے حریفاں
نگاہ چشمِ ساقی نیز پیوست
مشو منکر کہ در اشعار ایں قوم
ورائے شاعری چیزے دگر ہست

.....

ورائے شاعری چیزے دگر کی کچھ کچھ جھلک خالد کے کلام میں بھی نظر آتی ہے جو چندھائی ہوئی آنکھوں کو نظر نہیں آسکتی۔ پس جب خالد، مادھول لال حسین، تخلیق کر رہا تھا تو خود مادھول لال حسین بن گیا تھا اور جب رحمان بابا پر نظم تخلیق کر رہا تھا تو خود رحمان بابا بن گیا تھا۔ رحمان بابا کی ایک غزل کا ردیف "درے واڑہ یو دی (تینوں ایک ہیں) ہے یہی ردیف رحمان بابا پر نظم کے ایک بند کا بھی ہے۔ جو دلسوزی و دلگری رحمان بابا کے کلام میں ہے وہی خالد کی پوری نظم میں موجود ہے۔ یہی حال مادھول لال حسین پر اس کی نظم کا ہے اور کمال یہ ہے کہ اردو میں تصوف برائے شعر گفتن خوب است والی روایتی شاعری کے قریب بھی نہیں گیا۔

خالد جتنا بڑا شاعر ہمیں آج دکھائی دیتا ہے اس سے زیادہ بڑا آیندگاں کو نظر آئے گا۔ کچھ لوگ وقت سے پہلے دنیا میں آتے اور آکر چلے جاتے ہیں۔ وہ بھی وقت سے پہلے آیا اور پہلے چلا بھی گیا۔ اپنے ہم عمر و ہم عصر کسی بھی شاعر سے اس کا مبلغ الفاظ نہ صرف زیادہ تھا بلکہ ہر لفظ کے جملہ معانی کے Shades سے اسی طرح آگاہ تھا جس طرح ایک کامل مصور کسی بھی رنگ کے جملہ شیڈز سے آگاہ ہوتا ہے۔ اپنی اس خصوصیت کی وجہ سے اس نے کسی بھی شاطر سے شاطر چور کے لیے، کتنی ہی ہیرا پھیری کرے، اپنے کلام کی چوری کو محال بنا دیا ہے۔

اشعار کی چوری عام رہی ہے فارسی میں بھی اور اردو میں بھی۔ اس گناہ کے ارتکاب سے بڑے بڑے شاعر بچ نہیں پائے۔ میر، غالب، ناسخ، انیس، اقبال سب کا دامن داغدار ہے، کسی کا کم کسی کا بہت زیادہ۔ اردو شعرا نے تو فارسی شعرا کے کلام پر تو ہلہ ہی بول دیا:

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم
باید اول ز تو پرسند چنیں خوب چرائی
(سعدی)

ہم پہ تم سے پیار کرنے کا جو رکھتے ہیں گناہ
تم سے یہ پوچھے کوئی تم اتنے پیارے کیوں ہوئے
(میر)

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا ست
(نظیری)

جس جا سے سراپا پہ نظر جائے ہے اس کے
آتا ہے یہی جی میں یہیں عمر بسر ہو
(میر)

کریماں را کہ دشت اندر درم نیست
خدا وندانِ نعمت را کرم نیست
(سعدی)

جو بخشی ہیں مال دولت سے ہیں خالی ان کے ہاتھ
اہل دولت جو ہیں وہ دست کرم رکھتے نہیں
(انیس)

بروز بیکسی کس نیست غیر از سایہ یار من
مگر آں ہم ندارد طاقتِ شبہائے تار من
(ناصر علی)

سینہ بختی میں کب کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے
کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا رہتا ہے انساں سے
(ناسخ)

مسی آلودہ لب بر رنگِ پان است
قیامت است تہِ آتش دخان است
(بیدل)

مسی آلودہ لب پر رنگِ پاں ہے
قیامت ہے تہ آتش دھواں ہے
(ناسخ)

اقبال نے فارسی شعرا کے علاوہ مغربی شعرا کو بھی پڑھ رکھا تھا۔

We are the last Clouds of a retiring storm
(ٹینی سن)

آخری بادل ہیں اک گزرے ہوئے طوفاں کے ہم
(اقبال)

Mine be a cot beside the hill

دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو
(اقبال)

اے وائے بر اسیرے کزیاد رفتہ باشد
در دام ماندہ باشد صیاد رفتہ باشد
(علی حزیں)

وائے ناکامی کہ خود صیدیم و صیادیم ما
یا اسیرے رفتہ از یادیم ما
(اقبال)

اور علی حزیں کا شعر بھی طبع زاد نہیں ظہوری کے مال پر ہاتھ مارا تھا:

برآں ناتواں صید بیداد رفت
کہ در دام ازیاد صیاد رفت
(ظہوری)

رہا غالب تو غالب غالب ہے۔ تحفۃ العراقین میں خاقانی مدح رسول میں کہتا ہے:

زیں نام چو ترکنم زباں را
صد بوسہ دہد لبم زباں را

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے
(غالب)

چو ما از حرف خود در تنگنائیم
چساں چیزے دگر بروے فزائیم
(محمود شبستری)

یعنی عشق و عرفان کے بعض مقامات و معاملات ایسے ہیں کہ انسانی زبان کے الفاظ ان کے بیان کے لیے ناکافی ہیں اور انسان کے پاس الفاظ کے علاوہ کچھ ہے ہی نہیں تو کس چیز کے اضافے سے ابلاغ کیا جاسکتا ہے۔ غالب نے اس مضمون کو مجروح کر کے رکھ دیا:

بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے
(غالب)

اگر بیدل نے یہ نہ کہا ہوتا:

تا کے زخلق پردہ بُرد افگنی چو خضر
مردن بہ از خجالتِ بسیار زیستن
(بیدل)

تو غالب یہ شعر کہہ نہ پاتا:

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لیے
(غالب)

فطرت بیدل ہماں آئینہ معجز نماست
ہر سخن کز خامہ اش می جوشد الہام است و بس
(بیدل)

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے
(غالب)

در شرابم چیزے دیگر ریختی
بادہ تہا نیست ایں آمیختی
(رومی)

کب مجھ تک ان کی بزم میں آتا تھا دور جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں
(غالب)

ایں گوش در محبت احول شدے چو چشم
تا ہر چہ گفتی از تو مکرر شنیدے
(طالب آملی)

یعنی تیری محبت میں یہ کان احول (جسے ایک کے دو نظر آتے ہیں) ہوتے تا کہ میں تیری ہر بات دو دو بار سنتا:

بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر
(غالب)

اصل اور نقل کا فرق صاف ظاہر ہے۔

ہست صد منت بجاں از غیبتِ بدگو مرا
تا بایں تقریب می آرد بیاد او مرا
(شرف قزوینی)

گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے بایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے
(غالب)

راز دیرینہ ز رخ پردہ برانداخت دریغ
حال من شہرہ بازنشائے غزل ساخت دریغ
(نظیری)

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے
(غالب)

کردہ ام توبہ زمے من اگر اے سروسہی
تو خود ایں توبہ نہ کردی کہ مرا مے ندہی
(بیگی دختر جلائر)

میں اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا
(غالب)

بیار بادہ کہ جانم دمے زنالہ برآید
ہزار زمزمہ از دل بیک پیالہ برآید
(عرفی)

پھر دیکھیے انداز گل افشانی گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے
(غالب)

جام جہاں نماست ضمیرِ منیر دوست
اظہار مدعاے خود آنچہ حاجت است
(حافظ)

جام جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر
سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے
(غالب)

اور ایک مثال غزل سے الرجک جوش سے بھی
جوان کی نظم میں نظر سے گزری اور یاد آگئی:

عناں کشید رو اے بادشاہ کشور حسن
کہ نیست برسرِ راہے کہ دادخواہے نیست
(حافظ)

عناں کشیدہ گزر اے خدیو کشور ناز
کہ ہر قدم پہ ہے اک حشر دادخواہوں کا
(جوش)

آصف ثاقب کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ ہر کوئی غالب کر رہا ہے۔ نہیں کرے گا تو غالب کے معنوی مرشد ابوالمعانی بیدل کا یہ قول سچ کیسے ہو پائے گا:

بر قبولِ عام نتواں زیست مغرور کمال
آنچہ تحسیں دیدہ ای زیں قوم دشنام است وبس

.....

رانجھا رانجھا کرنے والی اپنے عشق میں صادقہ تھی آپ ہی رانجھا ہوگئی۔ غالب غالب کرنے والوں میں سے سوائے وحشت کلکتوی کے کس نے غالب سے اخذ فیض کیا۔ فارسی شاعری کی تاریخ میں بحرِ بے ساحل ابوالمعانی بیدل کی آواز اور انداز بالکل مختلف اور نیا ہے جسے غالب نے رنگ بہار ایجادی بیدل کا نام دیا ہے اور اس کے تتبع کی کوشش بھی کی اور مشکل کا کھلے دل سے اعتراف بھی کیا۔ غالب اردو شاعری کو اس نئے ذائقے سے آشنا کرنا چاہتا تھا اور اردو میں فارسی کی سی سکت نہ تھی۔ شعر چیستاں بن گئے۔ اس کی طرف توجہ غالب کے مزاج دان احباب نے بھی دلائی:

آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمایش
گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل

.....

مشکل کا احساس مخالفین کو تو تھا ہی:

مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

.....

اس صورت حال نے میر کی قربت اختیار کرنے کی طرف مائل کیا۔ آسان زبان میں شاعری شروع کی:

ریختے کے تمھی استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

لیکن میر کا مزاج اور تھا غالب کا اور۔ شاعر کا مزاج شاعری پر اثر انداز ہو کر رہتا ہے۔ حریفوں کو یہ کہنے کا موقع مل گیا:

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

.....

اگر کوئی آدمی کسی ایسی جگہ کھڑا ہو کر یونہی آسمان میں ایک خاص جانب دیکھنا شروع کر دے تو دیکھا دیکھی اور لوگ بھی اس کے پاس کھڑے ہو کر ادھر ہی کو دیکھنا شروع کر دیں گے۔ نئے آنے والے سے کوئی یہ نہیں کہے گا کہ آسمان میں کچھ نہیں، لوٹ جاؤ۔ نفسیات انبوہ یہی ہے۔ غالب غالب کرنے والوں میں سے ہر کوئی یہی خیال کرتا ہے کہ غالب اگر میری سمجھ میں نہیں آیا تو میری سمجھ میں ہی نہیں آیا اوروں کی سمجھ میں تو آیا ہے جبھی تو سب غالب غالب کر رہے ہیں۔ آخر غالب میں کچھ تو ہے، پھر:

کیوں زیاں کار بنوں سود فراموش رہوں

.....

اور دانشوروں میں شامل ہونے سے رہ جاؤں۔ غالب بحیثیت شخص اردو کے جملہ شعرا میں سب سے زیادہ دلکش و دلآویز اور قابل تحسین شخصیت کا مالک شاعر تھا۔ قارئین شخصیت کی تحسین کو اس کی شاعری کی طرف ٹرانسفر کر دیتے ہیں۔ غالب کا جو شعر بظاہر آسان بھی ہے تو غور نہ کرنے کی وجہ سے آسان ہے: مثلاً

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

.....

یہ شعر زباں زد خواص و عوام ہے۔ دوسرا مصرع تو ضرب المثل کے درجے پر فائز ہے اور ان لوگوں کو بھی یاد ہے جو شعر و شاعری سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔ جنت کی حقیقت جو غالب کو معلوم ہے کیا غالب غالب کرنے والوں کو بھی معلوم ہے، معلوم ہے تو کیا ہے۔ کیا دوسرا مصرع اسی معلوم حقیقت کے بارے میں ہے یا اس جنت کے بارے میں جو اس معلوم حقیقت سے مختلف ہے، جس (مختلف جنت) میں جانے کی ہر کوئی دعا مانگتا ہے۔ جنٰت تجری من تحتها الانهٰر (قرآن) جس میں دودھ کی شہد کی نہریں ہیں، حوریں اور قصور (قصر کی جمع) ہیں۔ دوسرا مصرع اس جنت کے بارے میں تو ہو نہیں سکتا جس کی حقیقت غالب کو معلوم ہے کہ بیان تناقض (Self Contradiction) کا شکار ہو جاتا ہے۔ دوسرا مصرع معلوم حقیقت پر طنز نہیں ہو سکتا اور نہ اس جنت پر جس کا ذکر قرآن میں ہے اور ہر ایماندار اس میں جانے کی دعا مانگتا ہے کہ غالب گنہگار (بقول خود) تھا کافر نہیں تھا۔ حمد کہی، نعت کہی، منقبت کہی، ہر گنہگار مسلمان کی طرح وہ بھی آمرزش کا طلبگار تھا۔ دوسرا مصرع

جب نہ اس حقیقت پر طنز ہے جو غالب کو معلوم ہے نہ اس جنت پہ جس کا ذکر قرآن میں ہے اور ہر ایماندار کی تمنا، تو ذی فہم و شعور قاری یا سامع معضلہ (dilemma) کے دو سینگوں کے درمیان پھنس جاتا ہے جن سے بچ پانا ممکن نہیں۔ جب کسی بات کا مفہوم پورے طور پر منتقل نہ ہو تو فصاحت و بلاغت کے درجے سے نیچے گر جاتی ہے۔ غالب کا یہ شعر بے معنی تو ہرگز نہیں لیکن معانی تک رسائی ہرگز دشوار ہے۔ کسی بات سے مانوس ہونا اس کے معانی سے آگاہی کی دلیل نہیں۔ ملتان میں دال کم وقت میں گلتی ہے اور ناران میں زیادہ وقت لیتی ہے۔ مشاہدے کی بات ہے لیکن مشاہدے میں آنے والی اس بات کی وجہ ہر مشاہدہ کرنے والا نہیں جانتا کہ وہ جاننا چاہتا ہی نہیں۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ کوئی چیز اوپر اچھالی یا پھینکی جائے تو نیچے زمین پر آ گرتی ہے لیکن ہر کوئی یہ نہیں جانتا کہ ایسا کیوں ہے۔ مانوسیت اسے یہ پوچھنے دیتی ہی نہیں۔ دیوان غالب کی جتنی شرحیں لکھی گئی ہیں اتنی کسی دوسرے شاعر کی موجود نہیں۔ اگر غالب مشکل شاعر نہ ہوتا تو ایسا نہ ہوتا۔ شگفت انگیز یہ کوئی بھی دو شارح باہم متفق نہیں۔ یہ ایک اور ثبوت اس کے مشکل شاعر ہونے کا ہے۔ مشکل اس لیے کہ طرز بیدل میں ریختہ لکھنا چاہتا ہے اور کسی حد تک ناکامی کا اسے اعتراف بھی ہے جب کہ غالب غالب کرنے والے اس اعتراف میں اس کے شریک نہیں ہر چند فی کُلِّ وادٍ یھیمون (قرآن) ہر وادی میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں اگر کسی نے کہیں یہ پڑھ لیا کہ رومی نے پچپن بحروں میں شعر کہے تو اسے غالب کا خیال ستانے لگے گا۔ پھر کسی نے آٹھ بحریں شمار کیں تو دوسرا ایک کی دو بنا کر تعداد نو کر دے گا۔ اگر کسی کو نظریۂ شعر کا خیال آئے گا غالب کے نظریہ شعر کا خیال آئے گا۔ شعر غالب کے ہوں گے اور نظریہ و نظریہ خود "محقق" کا۔ اگر کسی کا دھیان اس طرف گیا (جواب تک نہیں گیا) کہ غالب کو آم اچھے لگتے تھے اور بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے پڑھ کر غالب اور آم کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کا امیدوار بن جائے گا اور کسی بھی یونیورسٹی کا اردو ڈیپارٹمنٹ اس کی امید پر پانی نہیں پھیرے گا۔ شروع کے صفحات میں آموں کی طبی افادیت کا ذکر ہوگا پھر کتاب کے دو حصے ہوں گے، تخمی آم اور قلمی آم۔ تخمی والے حصے میں تخمی آموں کی مصنوعات آم کا اچار اور امچور کے الگ الگ دو باب ہوں گے اور اس پر غور ہوگا کہ کیا غالب نے آم کا اچار بھی کھایا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا جائے گا کہ اچار میں کیا کیا ڈالا جاتا ہے اور تجارتی پیمانے پر کون کونسی کمپنیاں اچار بناتی ہیں اور کتنا ٹیکس دے کر قومی خزانے میں جمع کراتی ہیں۔ قلمی آم کا

حصہ بھی کئی ابواب پر مشتمل ہو گا قلم (grafting) کیسے کی جاتی ہے کس موسم میں کی جاتی ہے، قلمی آموں کی ہر قسم کا بیان الگ الگ باب میں ہوگا۔ Ecology کا ذکر بھی آئے گا۔ کونسی قسم کس ملک کی زیادہ لذیذ سمجھی جاتی ہے۔ غالب کے زمانے میں کونسی اقسام رائج تھیں۔ آخر میں آم کے درختوں اور پھلوں کو لگنے والی بیماریاں اور ان کا علاج بھی بتایا جائے گا اور یاد رہا تو یہ بھی بتایا جائے گا کہ کونسا ملک کتنا آم برآمد کر کے کتنا زرمبادلہ کما رہا ہے۔ 'محقق' نہ صرف ڈاکٹریٹ کی ڈگری کا حامل ہو جائے گا بلکہ ایوارڈ کا مستحق بھی ٹھہرے گا۔

یونیورسٹیوں کے اردو کے شعبوں کا اگر کوئی دوسرا شعبہ برابر کا مقابلہ کر رہا ہے تو وہ اسلامیات کا شعبہ ہے۔ اسلامیات کے ڈاکٹر صاحبان اور پروفیسر صاحبان کے لیے عربی جاننا ضروری نہیں۔ قومی زبان کفایت کرتی ہے۔ آخر اس کا بھی کوئی حق ہے۔ اس میدان میں ایسے ڈاکٹر صاحبان بھی موجود ہیں جنھوں نے میٹرک پاس کر کے پرائیویٹ طور پر ایف اے، بی اے پھر ایم اے بھی کر لیا۔ پھر پی ایچ ڈی بھی پاس کر لیا۔ ایک صاحب (مرحوم) کالجوں، یونیورسٹیوں، دینی مدارس کے اساتذہ سے یہ درخواست کرتے تھے کہ آپ کے گاؤں، شہر میں دیوبند سے فارغ التحصیل کوئی ہو تو مجھے اس کے حالات لکھ دیں۔ میرے گاؤں میں کوئی نہیں تھا، میں ان کی مدد نہ کر سکا۔ جن جن نے کچھ لکھ کر دیا اسے Compile کر کے یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر لی۔ ''تھیسس'' (اگر یہ تھیسس تھا) کو ریکمنڈ کرنے والے، پاس کرنے والے بھی تو ایسے ہی تھے۔

ہماری یونیورسٹیاں اردو (قومی زبان) اور اسلامیات (قومی مضمون) میں سب سے زیادہ ڈاکٹر صاحبان پیدا کر کے قوم کو خود کفیل بنا رہی ہیں اور دینی مدارس علما پیدا کر کے۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ دیگر شعبوں میں حال قابل ستائش ہے۔ آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ پرویز ہود بھائی نے ضیا دور کی ایک سائنس کانفرنس میں شریک طبیعات کے ایک پروفیسر کا یہ انکشاف نقل کیا ہے کہ ان صاحب کے بقول جنات چونکہ آگ سے پیدا ہوئے اس لیے انہیں تسخیر کر کے پاکستان میں انرجی کی کمی دور کی جا سکتی ہے۔ عقل پر بخت کی برتری اور فوقیت تسلیم کرنی پڑتی ہے۔

میرے بچپن میں یہ گانا بہت مشہور تھا:

گھر آیا میرا پردیسی
پیاس بجھی میری اکھین کی
اب دل توڑ کے مت جانا
روٹی چھوڑ کے مت جانا

.....

میں چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا یا پاس

کر چکا تھا۔ جب بھی گانا سنتا تو یہی باور کرتا کہ کوئی ماں رو رو کر یہ بول بول رہی ہے جس کا بدتمیز بیٹا شلغم کی ترکاری (جو اس عمر میں مجھے سخت ناپسند تھی) کے ساتھ روٹی کھا لینے کا کہنے پر ماں سے لڑ کر گھر سے بھاگ گیا۔ کسی نے گھاس نہ ڈالی تو شرمندہ ہو کر لوٹ آیا۔ اکلوتے بیٹے کی جدائی میں ماں کا رو رو کر بُرا حال ہو گیا تھا۔ بیٹے کو آتا دیکھ کر خوشی سے آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ گھر آیا میرا پردیسی ___ اب دل توڑ کے مت جانا ___ روٹی چھوڑ کے مت جانا۔ روٹی کا لفظ مجھے روٹی سنائی دیتا تھا۔ حالانکہ نہ کوئی ماں تھی نہ کوئی بیٹا، میں تھا جس نے قیاس آرائی کے بل پر ماں اور بیٹا ایجاد کر کے اپنے آپ کو چکی کی مشقت میں ڈال رکھا تھا۔

جو کچھ میں نے گانے کے ساتھ کیا وہی کچھ غالب کی شاعری کے ساتھ کرنے والے کر رہے ہیں۔ غالبیات کے 'منتہی' کسی ڈاکٹر صاحب یا پروفیسر صاحب کی کوئی کاوش پڑھنے کو ملتی ہے تو دعا دیتا ہوں کہ مجھے میرے بچپن کے معصومانہ ایام یاد دلا کر مجھ پر وہ احسان کیا ہے جسے اتارنا ممکن نہیں۔ اقبال کا یہ شعر بے اختیار زبان پر آ جاتا ہے:

ظاہر ترے احوال ہیں مجھ پر بھی کہ میں بھی
مدت ہوئی گزرا تھا اسی راہگزر سے

.....

محترم آصف ثاقب گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد میں بزمانہ طالب علمی مجھ سے ایک سال آگے تھے صدق و خلوص کا پیکر ہیں اور بحیثیت انسان مجھ سے بدرجہا بہتر و برتر۔ میں انہیں ایسا ہی خیال کرتا ہوں۔ جھوٹ نہیں بول رہا نہ بولتا ہوں کہ لعنت اللہ علی الکاذبین (قرآن) کی آیت یاد رہتی ہے۔ آجکل چوٹی کے مسلمان اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم پڑھ کر جھوٹ بلوانے کا گناہ شیطان رجیم کی کارستانی سمجھ کر خود کو گناہ کے ارتکاب سے بچا لیتے ہیں۔ جھوٹ کے فوائد بے شمار ہیں اور ان سے محروم نہیں رہتے - آصف ثاقب Sciences کے سٹوڈنٹ تھے وہ ان کے ہو رہے اور میں Mother of Sciences (فلسفہ) کا۔ اسی کا ہو رہا۔

او بہ صحرا رفت و ما در کوچہ ہا رسوا شدیم

چھ دہائیوں سے زیادہ مدت پر محیط شناسائی کی وجہ سے بھی مجھے بہت عزیز ہیں۔ فلسفہ خوانیوں نے میری عادتیں خراب کر رکھی ہیں، ہر قابل غور و توجہ بات کو کما حقہ سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں، نہ سمجھ پاؤں تو سٹپٹاہٹ ہوتی ہے۔ سٹپٹاہٹ تحریر پر بھی اثر انداز رہتی ہے۔ مدعی دانش نہیں۔ دانشوری نہایت اونچا مقام ہے۔ من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو پر عمل کبھی نہیں رہا۔ مقبولیت حاصل کرنے کے مواقع کی تاک میں کبھی نہیں رہا

کہ اپنی راہ چلنے کے بجائے دوسروں کی راہ پر چلنا پڑتا ہے۔ خضر ہوں نہ الیاس کہ دوسروں کی راہبری کی دھن سوار رہے۔ دانش کے ساتھ تعلق ہے تو بس اتنا:

تا بد انجا رسید دانشِ من
کہ بدانم ہمیں کہ نادانم

.....

بیاض (جولائی) میں محترم آصف ثاقب نے، غالب غالب ہے، کے زیرعنوان سائنسدان غالب کو متعارف کروایا ہے:

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالی نے دکاں سب سے الگ

.....

میں اپنی نیک نامی کے لیے نہیں، پرانا تعلق نباہنے کے لیے دکان پر سیلز مین کے طور پر موجود ہوں۔ سائنس میں چند الفاظ میں ابلاغ ہو جاتا ہے۔ فلسفے میں بال کی کھال اتاری جاتی ہے۔ نثر نویسی کا ملکہ اور مشق نہ ہونے کی وجہ سے انھوں نے اشارت سے کام لیا ہے اور بتایا ہے کہ سائنس میں بھی غالب نے بعد از غالب انکشافات تک سو سال پہلے اپنے فکر رسا سے رسائی حاصل کر لی تھی۔ سطور آئندہ ان کے اشارات کی توضیح و توسیع ہیں۔ میں درمیان نہیں، انہی کے مآل کو Magnify کر کے دکھا رہا ہوں۔

اوجِ چرخ مُلاقی ان کا
سارا ہفت طباقی ان کا
محفل ان کی ساقی ان کا
آنکھیں میری باقی ان کا

.....

بقول آصف ثاقب "غالب کے فکر و تامل میں مشاہدے کے اثرات شدت کے ہیں۔ ان کے تنوع میں سائنسی حقائق کی تصدیق حاصل کلام ہے۔ یہ شعر بائنی کی اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ کائی Algae جمع واحد Alga) سبز خلیوں سے بنتی ہے یا صرف ایک سبز خلیے (cell) سے۔ شعر ہے:

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روئے آب پر کائی"

.....

اس حقیقت کی تفصیل یہ ہے کہ بیالوجی (بائنی اور زوالوجی) زندگی کی مختلف Stages کا یعنی اس کے ظہور کی مختلف حالتوں اور صورتوں کا مطالعہ ہے۔ Bio اور حیات ہم معنی ہیں۔ بائیوگرافی سوانح حیات_ zo میں بھی یہی معنی موجود ہیں۔ فارسی میں زیستن، زیست، زاون، زاد، زادہ، پشتو میں ژوند (زندگی) ژوندے (زندہ) زوے (زادہ یعنی بیٹا) زلمے (جوان) خالص اردو یعنی ہندی میں جینا، جیو، جیتا، پنجابی میں جیندا، ہاں کے بجائے جی دعائیہ لفظ مستعمل چلے آ رہے ہیں۔ بائنی کو اولیت اس لیے حاصل ہے کہ زندگی کی اصل یعنی جڑ تک پہنچنے کے لیے محققین کی

کاوشوں کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔ مادۂ مردہ اور مادۂ زندہ میں امتیاز کا نقطۂ آغاز یہیں ہے۔ الجائی (کائی) اور فنجائی میں قریب کی نسبت ہے۔ فنجائی (مشروم یعنی کھمب) ہیں۔ پھپھوندی سے پنسلین دریافت ہوئی دوسری جنگ عظیم میں زخمی ہونے والوں کے زخم ٹھیک نہیں ہو رہے تھے۔ پنسلین معجزہ ثابت ہوئی۔ کائی کے حوالے سے صرف ایلوپیتھی میں ہی غالب کی پیش بینی درست ثابت نہیں ہوئی بلکہ طب مشرق میں بھی غالب کو دستگاہ حاصل تھی۔

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

....

سبزہ کائی تک محدود نہیں۔ سبز رنگ فطرت کا پسندیدہ ترین ہے۔ الجائی سے لے کر Angiosperms اور Gymnosperms تک میں یہ رنگ پایا جاتا ہے۔ ہرا رنگ اور ہریالی صحت بخش ہے۔ آنکھوں کی نظر ہریالی دیکھنے سے تیز ہوتی ہے:

از دیدنِ سبزہ نور چشم افزاید

....

اسی لیے کہتے ہیں کہ ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا نظر آتا ہے۔ ہربل میں بھی ہرا کی آواز موجود ہے اور ہربل میڈیسن کا تعلق طب مشرق سے۔ غالب نے سبزے کے ساتھ گل کا بھی ذکر کیا ہے، جس سے گلقند بنتی ہے۔ بوعلی سینا نے گلقند کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس نے ٹی بی یعنی تپ دق کے ایک مریض کا جس کا مرض آخری سٹیج پر تھا گلقند سے علاج کیا اور یہ بھی کہا کہ میں نے کتنی مدت تک اسے کتنی گلقند کھلائی بتا نہیں سکتا۔ اسی طرح ایک اور درخت برمی سرخ جو گلیات اور کاغان میں پایا جاتا ہے کینسر جیسے موذی مرض کے لیے شفا بخش ہے۔ مقامی زبان پلدر کہلاتا ہے۔ چیڑھ، چیل، کاج، (ایرانی، فارسی) نشتر (پشتو) ایک ہی درخت کے نام ہیں یعنی Pinus longifolia کے۔ علی عباس جلالپوری نے خردنامہ، جلالپوری میں چلغوزہ کے معنی چیل (پرندہ) کا مغز بتائے ہیں۔ غوزہ کا معنی مغز نہیں بلکہ Cocoon ہے۔ چیل (خراسانی فارسی) کے ساتھ جو پھل لگتا ہے Cocoon یا غوزہ ہے۔ جنھیں چلغوزے کہتے ہیں، اسی کے اندر ہوتے ہیں۔ چیل کے چلغوزے گھٹیا کوالٹی کے ہوتے ہیں۔ اعلیٰ کوالٹی کا درخت جمنوسپرمز کی ذیل آتا ہے۔ غالب نے زیر نظر شعر میں سوالیہ انداز اس لیے اختیار نہیں کیا کہ اسے حیرت کا اظہار سمجھا جائے بلکہ مسلمانوں کو غور و فکر کی طرف متوجہ کیا ہے کہ تمھیں قرآن میں ربّ زدنی علما (اے رب میرے علم میں اضافہ فرما) کی دعا

سکھائی گئی اور تم اسے بھول کر اور ہی دعائیں کرتے رہتے ہو۔ علم اور سائنس دونوں کے معنی جاننا کے ہیں۔ سرسید کو بھی غالب نے ہی سائنس کی طرف متوجہ کیا تھا۔ سرسید نے آثار الصنادید کی تقریظ غالب سے لکھوانا چاہی تو غالب نے لکھ دی لیکن سرسید نے شامل نہیں کی کیونکہ غالب نے کہا تھا:

مردہ پروردن مبارک کار نیست

.....

اور آثار الصنادید مردہ پروری ہی تو تھی۔ یہ بھی کہا کہ:

صاحبانِ انگلستاں را نگر

.....

کہ سائنس (علم) کی بدولت انگریز دنیا پر حکومت کر رہے ہیں۔ جمال الدین افغانی بھی غالب سے متاثر تھے۔ اپنے ایک مضمون میں مولویوں پر طنز کرتے ہوئے لکھا کہ یہ لوگ جس لیمپ (اہل مغرب کی ایجاد) کی روشنی میں شمسِ بازغہ پڑھتے ہیں، بھڑکنے لگے تو نہیں جانتے کہ کیوں بھڑک رہا ہے کہ اسے ٹھیک کر دیں۔ عنایت اللہ خان المشرقی نے اپنی کتاب "تذکرہ" مسبع و مقفیٰ عربی میں لکھی ہی دینی مدارس سے فارغ التحصیل علاموں کے لیے ہے کہ مسلمان وہ سائنسدان ہیں جو انسانیت کی بھلائی کے لیے ایجادات کر رہے ہیں چاہے کوئی ہوں۔ رنگ، نسل اور دینی عقائد کی کوئی قید نہیں۔ سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے غالب کا یہ شعر بھی توجہ طلب ٹھہرتا ہے۔ طب مشرق کے حوالے سے:

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب
اب عناصر میں اعتدال کہاں

.....

کہ ساری گڑبڑ عناصر (آتش و آب و خاک و باد) میں اعتدال قائم نہ رہنے کی وجہ سے ہوتی ہے انہی عناصر سے چار خلطیں بھی متعلق ہیں، دم (خون) صفرا، سودا، بلغم) اور چار مزاج بھی دموی (Sanguine) سوداوی (melancholic) اور صفراوی (Cholic) اور بلغمی (Phlegmatic) - سودا (melancholia) کا ترجمہ عربی کتب طب کے تراجم میں مالنخولیا لکھا گیا لیکن ن کا نقطہ شوخ نہ ہونے کی وجہ سے یا لکھا رہ جانے سے مالنخولیا اور قیاس کی بنا پر مالیخولیا کر دیا گیا۔ غالب نے کہا:

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

.....

سودا (مالیخولیا) کے غلبے کی علامت ہے۔ یہ بھی کہا تھا:

آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

.....

بقول آصف ثاقب "دوسرے مصرعے میں لفظ بات پر زور ہے کہ ہنسنے کے لیے کسی بات کی

ضرورت نہیں بغیر بات کے ہنسے جا رہے ہیں۔"
غلبۂ سودا (مالیخولیا) میں مزید زیادتی۔ اسی طرح صفرا کی زیادتی کی حالت کا بیان بھی موجود ہے:
اُڑنے سے پیشتر ہی مرا رنگ زرد تھا

.....

بلغمی مزاج والے کو بھی مذکور کر دیا:
اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

.....

مالیخولیا کے لفظ کی طرح فلگم (Phlegm) کا نقطہ بھی نیچے گر کر بلغم بن گیا۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ دموی مزاج کا ذکر رہ گیا:
جوے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق۔ "اور اب یہ شعر:
ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

.....

کیمسٹری کی وضاحت کر رہا ہے کہ حلقۂ دام خیال ایٹم سے خاص ہے۔ ایٹم کے الیکٹران، پروٹان، نیوٹران حلقے کی صورت میں ہیں۔ یہ حقیقت ہے کسی فریب میں نہیں آنا چاہیے۔" نیوکلیس چونکہ مرکز میں ہوتا ہے اس لیے حلقے میں شامل نہیں ہوتا۔ الیکٹران، پروٹان، نیوٹران اسی کے گرد طواف کرتے ہیں۔ نیوکلیئر یا اٹامک انرجی انہی اسرار کو سمجھنے سے حاصل ہوتی ہے۔ کیسے کیسے اسرار کی طرف اشارے کر دیے تھے غالب نے۔ حلقے کا لفظ غالب نے ایک اور شعر میں بھی استعمال کیا ہے:
بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

یہاں ایک ہی حلقے کو زنجیر کہہ دیا ہے حالانکہ زنجیر کئی حلقوں پر مشتمل ہوتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح ایٹم میں اگر دھماکہ کیا جائے تو بے پناہ آگ نکلتی ہے۔ آتش سے heat پیدا ہوتی ہے جو انرجی کی ایک صورت ہے۔ فزکس کی نصابی کتب میں ہیٹ پر پورا ایک باب شامل رہتا ہے۔
غالب کی ہی ہم عصر ایران میں مولا کی دیوانی قرۃ العین طاہرہ بھی تھی۔ شاعری بھی کرتی تھی۔ اپنے ایک شعر کی وجہ سے یاد آگئی اور شعر غالب کے شعر سے:
جذّ وات شوقک الجمت بسلاسلِ النعم والبلا
ہمہ عاشقانِ شکستہ دل کہ دہند جاں برہ ولا

.....

(ترے شوق کے دہکتے انگارے غم اور ابتلا کی زنجیروں میں بدل کر روک رہے ہیں تاکہ شکستہ دل عاشق محبت کی راہ میں جان سے گزر جائیں)
روح القدس غالب کا ہمزبان نہ ہو کر بھی غالب کو داد دیتا رہا تو اس مجذوبہ مولا والی کی زبان بھی جانتا تھا کہ عربی کے اشعار اور مصرعے بھی اس پر نازل ہوا کرتے تھے رومی اور حافظ کی طرح۔ اگر رومی، حافظ اور طاہرہ ایک ساتھ دوبارہ دنیا میں آجائیں تو مولا کے یہ دو دیوانے مولا کی اس دیوانی کو میری بیٹی میری بیٹی کہہ کر دل سے لگا لیں اور ماتھا چومنے لگ جائیں۔
مذہب عشق از ہمہ دیں ہا جداست

اور

اگر عشقِ بتاں کفر است بیدل
کسے جز کافر ایمانے نہ دارد

....

یہ میں بیچ میں یونہی آ گیا اور کسی اور کے مال کی ستائش شروع کر دی۔ معذرت خواہ ہوں۔ آصف ثاقب کہتے ہیں ''غالب نے بحروں کی ہمہ گیری اور نیرنگی سے بھی حتی المقدور واسطہ رکھا ہے اظہار مفتعلن فاعلات مفتعلن فع (فاع) میں اگرچہ سامنے ایک ہی غزل ہے مگر بحر کے معنوی پس منظر میں کمال کی کیفیت ہے اس کا مطلع ہے:

آ کہ مری جان کو قرار نہیں ہے
طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے

....

اس بحر میں حافظ شیرازی نے لائق تقلید استعداد بہم پہنچائی ہے۔☆ '' آصف ثاقب جلدی میں بحر کا نام لکھنا بھول گئے جو منسرح مطوی مجدوع منحور ہے۔ اس بحر میں حافظ کا کلام ضرور موجود ہے لیکن غالب نے حافظ سے زیادہ اپنے پیرو مرشد ابوالمعانی بیدل کو قابل تقلید سمجھا۔ بیدل کی یہ دو غزلیں پیش نظر تھیں:

رنگِ حنا دو کفم بہار نہ دارد
آئنہ ام عکس اعتبار نہ دارد

اور

نشۂ یاسم غم خمار نہ دارد
دامنِ افشاندہ ام غبار نہ دارد

....

اسی بحر میں ایک بہت طویل قصیدہ بحضور رسالت مآب مولانا جامی کا ہے، صرف پہلا شعر یاد ہے:

گر نبود پردۂ صفاتِ محمدؐ
خلق بسوزد ز نورِ ذاتِ محمدؐ

....

البتہ خدا جانے محترم آصف ثاقب کو غالب کا یہ شعر یاد کیوں آنے سے رہ گیا:

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

....

کہ حلقۂ دامِ خیال سے مراد ایٹم کا حلقہ ہے تو کپڑے سے ٹیکسٹائل کی صنعت کی طرف بھی اشارہ موجود ہے۔ سولہ گرہ ایک گز اور گریبان پر ایک گز کا چوتھا حصہ کپڑا صرف ہوتا تھا۔ جو بھی عاشق ہوتے تھے موسم گل میں اپنا گریبان ضرور پھاڑتے تھے اور کبھی کبھی گریباں کا چاک دامن کے چاک سے بھی مل جاتا تھا۔ کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا، جس کو یہ خدشہ تھا:

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید ہی کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

....

گریباں پھاڑنے کا مظاہرہ کوچۂ جاناں میں ہوا کرتا تھا،

☆ اس بحر میں حافظ کی ایک یہ غزل ہے: روشنی طلعتِ تو ماہ ندارد — پیشِ تو گل رونق گیاہ ندارد

اور دوسری: بر سر آنم کہ گر ز دست بر آید

یوں پکاریں ہیں مجھے کوچۂ جاناں والے
ادھر آ بے ابے او چاک گریباں والے

.....

کوئی اپنا گریباں پھاڑنے سے پہلے جاناں کا دامن پھاڑنا چاہتا اور جاناں کہتا: میرا دامن چھوڑیے اپنا گریباں پھاڑیے اقبال کا جنوں زیادہ مستقل، بے باک اور گستاخ بھی تھا:

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک یا دامن یزداں چاک

.....

غالب معتقد میر تھا اور اقبال معتقد غالب۔ گریباں اور دامن ایک ہی چولی میں ہوتے ہیں اس لیے دونوں ساتھ ہیں۔ ''اقبال نے ایجری کے پیرائے غالب کے قرینوں سے سیکھے ہیں'' اقبال نے نہ صرف بانگ درا میں اس کا اقرار کیا ہے بلکہ جاوید نامہ میں بھی غالب کا ذکر حلاج اور طاہرہ کے ساتھ کیا ہے:

غالب و حلاج و خاتون عجم
شورہا افگند در صحنِ حرم

حلاج اور خاتون عجم نے شور مچا کر اہل حرم کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں۔ خاتون عجم نے تو وہ شور مچایا کہ ابدی نیند سونے والے بھی اُٹھ بیٹھے۔ ہر چند غالب کا قطرہ بھی حقیقت میں دریا تھا لیکن منصور کی تنگ ظرفی کی تقلید منظور نہ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہ کچھ ہلہ گلہ ضرور کیا ہوگا جبھی تو اقبال نے اس کا ذکر ان دونوں کے ساتھ کیا ہے بلکہ کچھ زیادہ ہی کیا ہوگا جو غالب کو اولیت دی ہے۔ انگریز کی حکومت تھی سخت سنسر شپ کی وجہ سے ممکنہ گڑبڑ پر فوراً قابو پالیا گیا۔ اقبال کے کانوں میں بھی اس کی بھنک پڑ گئی تھی۔ غالب کے قرین ہوتے ہوئے اس نے بھی صحن حرم میں بہت شور مچایا اور ضرب کلیم تصنیف کر ڈالی۔ مسولینی سے ملاقات کے لیے اٹلی جا پہنچا۔ پہلی جنگ عظیم میں انگریزوں کا بہت نقصان ہو چکا تھا۔ مصلحت کے تحت کوئی باز پرس نہیں کی کہ ہندوستان میں گڑبڑ بہت مہنگی پڑتی۔ میٹھے نے انگریزوں کو بنیوں کی قوم کہا ہے اور بنیے نقصان برداشت نہیں کر سکتے۔ ''اقبال نے ایجری کے پیرائے غالب کے قرینوں سے سیکھے ہیں'' یہاں تک کہ آم جتنے غالب کو پسند تھے اقبال کو بھی اتنے ہی پسند تھے۔ غالب نے آموں کی مدح میں جو اشعار کہے ہیں اقبال نے پڑھ رکھے تھے۔ جب اکبر الہ آبادی کو پتہ چلا کہ آم اقبال کو بھی بہت اچھے لگتے ہیں تو الہ آباد کے بارے میں یہ کہہ کر بھی:

یاں دھرا کیا ہے بجز اکبر کے اور امرود کے

.....

اقبال کی خاطر کو عزیز جانتے ہوئے امرودوں کی جگہ لنگڑا آم بھیجے۔ اقبال نے رسید دی:

الہ آباد سے لنگڑا چلا لاہور آ پہنچا

.....

اکبر نے ایک لنگڑا آم تو نہ بھیجا ہوگا پورا کریٹ تو ضرور ہی بھیجا ہوگا۔ اتنے آم غالب کو ملتے تو رسیدیوں ہوتی:

الہ آباد سے لنگڑے چلے دلی تک آ پہنچے

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر عابد اللہ غازی کی تصنیف جہدِ مسلسل

(علی گڑھ سے علی گڑھ تک) کا تنقیدی جائزہ

ڈاکٹر عابد اللہ غازی کی تصنیف جہدِ مسلسل ہمارے ہاتھ کیسے لگی تو اسے ہم نے الف سے ے تک پڑھا اور اس کا پس منظر کیا ہے؟ ان سوالوں کا جواب دینے سے پہلے ہم یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ تقریباً 20 سال قبل بیسویں اور اکیسویں صدی کے سنگم کے آس پاس ہمارا لیکچر ''تعلیمۂ اقبال کی سائنسی بنیاد'' دانشوران شکاگو نے منعقد کیا اور بعد ازاں ایک شعری نشست کا انعقاد بھی کیا گیا۔ تقریبات کے خاتمے کے بعد حاضرین نے ہمیں بتایا کہ آج اقرا بک سنٹر کا افتتاح بھی ہے اور یہ ہماری اس تقریب سے بریکٹ ہو گیا ہے لیکن ہمیں وہاں حاضری دینے ضرور جانا ہے۔ میزبان ہمیں بھی ساتھ لے گئے۔ وہاں ہمیں اقرا انٹرنیشنل ایجوکیشنل فاؤنڈیشن کے ناظم اعلیٰ سے متعارف کرایا گیا اور یہ ڈاکٹر عابد اللہ غازی تھے۔ چوکہ وہ انتہائی مصروف تھے اُن سے تفصیلی گفتگو تو نہ ہو سکی اور نہ ہی وہ ہمارے لیکچر میں آ سکے لیکن وہ ہمیں بحیثیت مصنف پہچان گئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انھوں نے ہماری کچھ تصانیف خرید کر اپنے بک سنٹر میں برائے فروخت بھی رکھ لیں۔ پچھلے ماہ جب ہم بسلسلہ بین الاقوامی کانفرنس برقدرتی سائنس اور ماحولیات شکاگو گئے تو ہمارے ذہن میں خیال آیا کہ کیوں نہ اقرا انٹرنیشنل ایجوکیشنل فاؤنڈیشن سے رابطہ کیا جائے؟ رابطہ ہوا تو ان کے 20 سال پرانے ناظم مسعود خان سے بات ہوئی۔ انھیں ہم پوری طرح یاد تھے اور وہ ایک مصنف کی حیثیت میں۔ پتہ چلا کہ مالک تو آجکل علیل ہیں یہاں تک کہ انھیں عیادت سے بھی منع کیا گیا ہے اور آجکل اقرا انٹرنیشنل ایجوکیشنل فاؤنڈیشن اور بک سنٹر کی دیکھ بھال اُن کی اہلیہ بیگم تسنیمہ غازی کر رہی ہیں۔ خوش آئند بات یہ تھی کہ ہمارا رابطہ ان سے کروا دیا گیا اور انھوں نے ہماری خوب میزبانی بھی کی۔ کتاب پڑھی اور ڈاکٹر عابد اللہ غازی کو بھی دکھائی جس پر انھوں نے اچھے الفاظ میں تعریف کی اور ساتھ ساتھ کتاب جہدِ مسلسل: علی گڑھ سے علی گڑھ تک بھی گفٹ کی جو آج ہمارے ہمارے سامنے ہے اور ہم اس کے بارے میں مختصراً تحریر کرنے کے لیے قلم اُٹھا رہے ہیں۔

جب ہم نے اس تصنیف پر نظر ڈالی تو محسوس ہوا

محمد رفیق خان

کہ جہدِ مسلسل ایک ایسی شخصیت کی کشمکش حیات کی روداد ہے جس جیسے مردانِ مومن کے لیے قرآن پاک میں فرمان ہے: لقد خلقنا الانسان فی کبد" بے شک ہم نے انسان کو مشکلات کے لیے پیدا کیا ہے۔" یا پھر مردِ مومن کے لیے علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ:

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے

ہماری کانفرنس شکاگو سے کینسل ہوگئی اور ہمیں اپنا تحقیقی مقالہ پیش کرنے کے لیے سان ڈائیگو جانا پڑا۔ گو بقول تسنیمہ آپا ڈاکٹر عابد اللہ غازی نے ہمارے ساتھ ملاقات کی خواہش کا اظہار شدت سے کیا لیکن نامساعد حالات کی وجہ سے ملاقات نہ ہوسکی۔ بس وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ یار زندہ صحبت باقی۔

ہم نے آدھی سے زیادہ کتاب تو ہوائی سفر میں ہی پڑھ ڈالی اور آدھی ہم نے واپسی پر لاہور سکول آف اکنامکس آتے جاتے پڑھی۔ کتاب اتنی دلچسپ ہے کہ ہم نے اپنی تمام مصروفیات کے باوجود اُسے مکمل پڑھا۔

جہدِ مسلسل کے مطالعہ کے بعد ڈاکٹر عابداللہ غازی کے جن مقاصد کی نشاندہی ہوتی ہے وہ یہ کہ گو اُن کی جدوجہد کا مقصد اعلیٰ انڈیا کی آزادی اور نشاۃِ ثانیہ تھا مگر اس کا سب سے بڑا محرک اُن کا دین اسلام تھا۔ ملک کی آزادی کے بعد اُن کا مشن ملتِ اسلامیہ کی فلاح و بہبود اور بالآخر ارضی سطح پر خلقِ خدا کو اُلجھے ہوئے حالات سے نکال کر صراطِ مستقیم پر ڈالنا تھا تاکہ وہ ہر لحاظ سے آزادی میں سانس لے سکے اور اپنی زندگیاں آسودگی کے ساتھ گزار سکے۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے اپنے دینی عقائد کو مضبوط کرنے کے لیے اہل سنت والجماعت کے اہم رکن ہونے کے باوجود انھوں نے دارالعلوم دیوبند کے مسلک کو اپنایا اور اپنے ذہن کو جدید سوچ دینے کے لیے سرسیّد احمد خان کی مکمل پیروی کی اور انھوں نے گو بہت سے تعلیمی اور تربیتی اداروں سے استفادہ کیا لیکن دارالعلوم دیوبند اور علی گڑھ یونیورسٹی نے اُن کی شخصیت کی استواری میں خاطر خواہ کردار ادا کیا۔

تصنیف سے واضح ہوتا ہے کہ ڈاکٹر غازی کا علی گڑھ سے علی گڑھ کا قیام آٹھ سال پر محیط ہے۔ اس سے قبل اُن کا علی گڑھ کے لیے لانچنگ پیڈ جنیدی صاحب جو کہ ہونہار بچوں کے صاحب ثروت بزرگ تھے اور اُن کے گھر کی بیٹھک میں ڈاکٹر عابداللہ نے دو سال یعنی 1949 اور 1950 بسر کیے اور میٹرک کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا جو اُس وقت کے حالات کے مطابق بہت بڑا اعزاز تھا۔ اُن کے شہر میں سمجھ لیں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور

اپنے ایک ایک رشتے دار، مہربان اور خیر خواہ سے وہ ٹوٹ کر گلے ملے اور بعض کے ساتھ لپٹ گئے۔ سب سے زیادہ انھوں نے اپنے والدین کو یاد کیا کیونکہ والد صاحب کسی اور شہر میں ایک جرنلسٹ کی حیثیت سے کاروبار میں مصروف تھے اور والدہ محترمہ اس عالم رنگ و بو سے رحلت فرما چکی تھیں۔ ذرا غور فرمایئے کہ انھوں نے اپنی والدہ محترمہ کو اُسی شدت سے یاد کیا جیسا کہ علامہ اقبالؒ نے اپنی والدہ کو ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' کیا۔ وہ ایک اعلیٰ پائے کے نثر نگار اور شاعر بھی ہیں فرمایا:

''آپ کے ''عابن'' نے آج آپ کی دعاؤں اور خواہشات کی تکمیل کی طرف بہت بھرپور قدم اُٹھایا ہے:

آیئے اور اس ڈگمگاتے ہوئے قدم کو سہارا دیجیے۔''

یہ الفاظ واقعی اقوالِ زریں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

جہدِ مسلسل: علی گڑھ سے علی گڑھ تک ڈاکٹر عابد اللہ غازی کی سوانح عمری کا ایک حصہ ہے جسے ہمارے خیال میں اسے اس کی جلد دوئم گردانا جا سکتا ہے جبکہ جلد اوّل میں اُن کے بچپن سے لے کر ہائی سکول تک کی روداد قلمبند ہو سکتی ہے۔ دریں چہ شک کہ ڈاکٹر غازی نے ایک مردِ مومن / مردِ مجاہد کی صورت میں زندگی گزاری ہے اور یہی ہمارا اُن کے بارے میں عقیدت مندانہ تخمینہ ہے۔ کتاب کے پچھلے صفحے پر اقرا انٹرنیشنل ایجوکیشنل فاؤنڈیشن کے مطابق ڈاکٹر غازی صاحب کے دوست احباب اور عزیز و اقارب جو کہ ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں کے اصرار پر انھوں نے اپنی آپ بیتی لکھنی شروع کی جو کہ ہزاروں صفحات پر پھیل گئی۔ اگر مکمل اشاعت ہوئی تو یہ چار جلدوں پر محیط ہو گی۔ انھوں نے علی گڑھ سے علی گڑھ کا دورانیہ باقی تمام جلدوں کو پس پشت ڈال کر لکھا کیونکہ اُن کی کردار سازی میں یہ دورانیہ میجر کنٹری بیوٹر تھا۔ ہماری نظر میں یہ ایک کیس سٹڈی (Case Study) ہے جو ارضی سطح پر بچوں، بوڑھوں اور جوانوں کے لیے اس حوالے سے مشعلِ راہ ثابت ہو سکتا ہے کہ انسان جو کہ اشرف المخلوقات ہے اُسے بامقصد زندگی کیسے گزارنی چاہیے۔

ڈاکٹر غازی نے اپنے علی گڑھ کے آٹھ سالہ طالب علمی دورانیے کو دو ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے پانچ سالوں میں انھوں نے بی اے فرسٹ کلاس میں کیا اور اسی دور میں انھوں نے ایک مقرر کی حیثیت سے انڈیا کے نامور تعلیمی اداروں سے تقریری مقابلوں میں حصہ لے کر لاتعداد انعامات جیتے جن کی بنا پر وہ سیکرٹری سٹوڈنٹس یونین کے مضبوط امیدوار نامزد ہوئے اور منتخب ہوئے۔ اس دور میں انھوں نے صدر یونین

کا انتخاب لڑا لیکن ہار گئے۔ مگر انھوں نے ہمت نہ ہاری کیونکہ وہ اس امر سے خوب آگاہ تھے کہ ''ناکامی کامیابی کا زینہ ہے۔'' ان دنوں ڈاکٹر ذاکر حسین جو بعد میں قومی سیاست میں آئے اور صدر ہندوستان منتخب ہوئے علی گڑھ کے وائس چانسلر تھے جبکہ ڈاکٹر غازی اُن کے منظورِ نظر طالب علم لیڈر تھے جن میں ڈاکٹر صاحب کو قوم کا مستقبل نظر آتا تھا۔ چھٹے سال میں اُن کے پھیپھڑوں پر بیماری کے حملے کے شبے میں انھیں تامبرم سینیٹوریم میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی سفارش پر داخل کرایا گیا اور انھوں نے وہاں باعزت طریقے سے وقت گزارا۔ ڈاکٹر غازی چھٹے سال کو بھی علی گڑھ کے دورانیے میں شمار کرتے ہیں۔

بقول ڈاکٹر غازی اُن کا ''دوسرا علی گڑھ کا دور جولائی 1957 سے شروع ہو کر مئی 1959 پر ختم ہوتا ہے'' اس دور میں لیڈنگ مارک سٹوڈنٹ یونین کی بلا مقابلہ صدارت جو کہ علی گڑھ کی تاریخ میں ایک ریکارڈ بھی ہے اور نیشنل کانفرنس آف یونیورسٹی سٹوڈنس آف انڈیا کی چیئرمین شب کا انتخاب تھا۔ اُن کا فرمان ہے کہ ''میں زندگی کے اس قدر تلخ دور کھٹ میٹھے تجربات لے کر یہاں پہنچا تھا جو شاید ہی کسی کا مقدر رہا ہو۔ میں نے پیدائش سے لے کر ہائی سکول ختم کرنے تک آٹھ گھروں میں پناہ لی اور سات تعلیمی اداروں سے اکتسابِ علم کیا۔'' دربدر ہونے کی بڑی وجہ اُن کے اقتصادی حالات تھے۔ اتنا کچھ پانے کے باوجود انھوں نے کبھی بھی اپنے آپ کو امیر زادہ نہیں گردانا بلکہ درویشی اور فقیری کو اپنا شعار بنایا۔ انھوں نے ہر محسن کو یاد رکھا اور اب تک یاد کرتے ہیں۔ انھوں نے اس امر کا کھلا اعلان کیا کہ مالی مشکلات کی وجہ سے اُن پر ایسا وقت آیا کہ وہ ہاسٹل میں فری کھانا کھاتے رہے اور اپنے محسنوں کے شکر گزار رہے۔ کچھ لوگوں نے ان کی بھلائی کا سوچا اور اس کا صلہ ڈاکٹر غازی نے یہ دیا کہ وہ کل عالم کی نامساعد حالات میں مدد کرنے پر ہمہ تن محو رہے اور رہیں گے۔

آخر میں ہم ڈاکٹر غازی کی شخصیت کے بارے میں بات کریں گے اور اُن کے محاسن کو اُجاگر کرنے کی سعی کریں گے۔ اُن کی شخصیت پر اُن کا بعنوان ''عابداللہ غازی کا تعارف'' چار صفحات پر محیط ہے۔ تحریر ہے مگر لکھنے والے کا نام نہیں دیا گیا۔ اس تحریر میں ڈاکٹر غازی صاحب کی شخصیت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کے محاسن کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ ہم اس کا شروع کا ایک پیراجوں کا توں قارئین کی نذر کر رہے ہیں۔ بعد ازاں ہم اسی حوالے سے اپنی رائے سے بھی آگاہی فراہم کریں گے۔

''وہ ایک طرف پختہ ایمان والا دیوبندی مسلمان تھا دوسری طرف مشائخ حیثیت کا پیرزادہ تھا۔ سیاست میں وہ کانگریسی نیشنلسٹ تھا۔ مسلمان فرقہ بندیوں سے دور ہندو مسلم اتحاد کا حامی تھا۔ وہ ماضی سے زیادہ مستقبل کی فکر کرنے والا انسان تھا جو ہندوستان کو اپنا وطن سمجھتا تھا اور پاکستان جانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا لیکن وہ اینٹی پاکستان نہ تھا اور جو تاریخی فیصلہ 14 اور 15 اگست کو عمل میں آ گیا تھا وہ اُسے تسلیم کرتا تھا اور چاہتا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان کی قیادت بھی اسے قبول کر لے۔''

اُس کے بعد تیسرے پیراگراف میں ہے کہ ''وہ کمیونسٹ نہیں تھا اور نہ ہی کمیونسٹ فلسفہ سے متاثر تھا لیکن نیشنل ایشوز پر اُس کی فکر نے کمیونسٹوں سے قریب تر کر دیا اور اسلام کے اُن داعیوں سے دور کر دیا جو ہندوستان کو نظام باطل سمجھتے تھے یا جن کی منزل پاکستان یا پھر امریکہ اور یورپ آ کر اسلامی ریاست قائم کرنا چاہتے تھے۔ ہماری رائے میں ڈاکٹر غازی کی شخصیت کا یہ تجزیہ برحق ہے۔ ہم کہیں کہیں ہلکا پھلکا اختلاف ضرور کرتے ہیں لیکن اگر گہرائی میں دیکھا جائے تو بات مفاہمت پر ختم ہوتی ہے۔ پہلی بات کہ وہ بنیادی طور پر دیوبندی مسلمان تھے اور اہل سنت والجماعت کے مشائخ خاندان سے تھے دونوں اوامر اُن کی گفتار سے عیاں ہیں۔ خاندان اور رشتے دار انگریزی کے خلاف تھے لیکن دیوبند مسلک میں لچک موجود تھی لہٰذا اُن کے دیوبندی مسلک سے متاثر ہونے نے انھیں سرسیّد کے راستے پر ڈال دیا اور وہ برائے اعلیٰ تعلیم علی گڑھ تمام رکاوٹوں کو پھیلانگتے ہوئے پہنچ گئے۔ سیاست میں وہ اکیلے کانگریسی نیشنلسٹ نہیں تھے اور ہندو مسلم اتحاد کے حامی۔ ہم کہیں گے کہ اس گروہ میں وہ اکیلے نہیں تھے بڑے بڑے نام جن میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، ڈاکٹر ذاکر حسین، قرۃ العین حیدر اور بہت سے آتے ہیں۔ انھوں نے انڈیا میں رہ کر جہاں انڈین مسلمانوں کے لیے تندہی سے کام کیا وہاں پاکستان کی فلاح و بہبود کے لیے بھی لگاتار خدمات سرانجام دے رہے ہیں کیونکہ اُس کی وجہ نہ صرف مذہب اسلام ہے علاوہ ازیں اُن کے بیشتر عزیز و اقارب پاکستان خصوصاً لاہور، کراچی اور بہاول پور میں آباد ہیں۔ وہ سب سے رابطے میں بھی ہیں اور ان کا دل ہر وقت ان کے لیے دھڑکتا بھی ہے۔ وہ اس خواہش کے ساتھ زندہ ہیں کہ بھارت اور پاکستان آپس میں مفاہمت کے ساتھ چلیں تاکہ دونوں ممالک سے غربت کا خاتمہ ہو۔

اُن کے یونیورسٹی کے حالات اور قومی سطح کی سیاست نے انھیں کسی حد تک اُن کی فکر کو متاثر کیا اور یونیورسٹی سیاست میں کمیونسٹوں نے اُن کا ساتھ بھی دیا۔ یہ قربت بالکل ایسے ہی تھی جیسی کہ علامہ اقبالؒ کی۔ اس قربت نے علامہ اقبالؒ مرحوم کو ''لینن خدا کے حضور میں'' جیسی نظم اور غزلوں میں اشتراکی فکر کی ترجمان سوچ کے اشعار کہے جن میں سے نمونے کا ایک شعر ہے:

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اُس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو

.....

لیکن اقبالؒ نے کبھی بھی اس فلسفے کو نہ اپنایا کیونکہ یہ اُن کی اسلامی اقدار کے منافی تھا۔ ڈاکٹر غازی چونکہ کٹر مسلمان تھے وہ بھی اس حد سے آگے نہ نکلے۔

بہرحال محاسن تو اُن کے لامحدود ہیں ہم انھی پر اکتفا کر کے اختتام اُن کے اسلوب اور زبان پر کر کے اجازت چاہیں گے۔ ڈاکٹر غازی صاحب کا اسلوب جزوی طور پر نثری اور جزوی طور پر شعری ہے۔ انھوں نے موقع محل دیکھ کر اپنے اور دیگر شاعروں کے اشعار تحریر کیے ہیں اور فٹ بیٹھے ہیں۔ زبان بالکل سادہ ہے اور سلیس ہے۔ گو انھوں نے ہندی بھی سیکھی اور دونوں زبانوں کو ساتھ ساتھ چلانے کی کوشش کی لیکن ہندی پر اردو حاوی نظر آتی ہے۔ ایک بات جو ہم نے محسوس کی وہ یہ کہ کئی جگہوں پر الفاظ کا استعمال شاید پرانا علی گڑھ والا ہے جبکہ پاکستان میں کچھ تبدیلی ہو چکی ہیں۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ کون سے الفاظ استعمال میں بہتر ہیں لیکن ہمیں زبان کے اس فرق سے جانکاری ضرور ہونی چاہیے کہ جو من کو زیادہ پسند آئیں اور دل پر لگیں اُن کا استعمال کیا جائے۔

قصہ مختصر! ہم اختتام سے پہلے یہ ضرور کہیں گے کہ ڈاکٹر عابد اللہ غازی جیسا دیدہ ور بڑی مشکل سے پیدا ہوتا ہے۔ حکیم الامت کا یہ شعر اُن کی شخصیت کا صحیح عکاس ہے:

عمر ہا در کعبہ و بت خانہ مے نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

.....

وہ آج کل علیل ہیں اور تسنیمہ آپا کی صحت بھی دگرگوں ہے جس کے باوجود وہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں اقرا انٹرنیشنل ایجوکیشنل فاؤنڈیشن کی نگہداشت کے فرائض بڑی ہمت سے انجام دے رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُنھیں ہمت دے اور ڈاکٹر صاحب کو صحتِ کاملہ عطا فرمائے تاکہ وہ قوم، ملت اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے جس مشن کی تکمیل کے راستے پر گامزن ہیں اُس کو بہ طرز احسن طے کر کے اپنی ''خودی'' کے حضور سرخرو ہو سکیں۔

☆☆☆☆☆

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کیلئے

سلمیٰ اعوان

شارلٹ برونٹے کے ناول بے شک جین آئیر ہو، شرلی یا ویلیٹ ہوں سب انگریزی ادب میں کلاسیک کا جو مقام حاصل کر چکے ہیں۔ اُس سے انگریزی ادب پڑھنے والا کوئی فرد انکار نہیں کر سکتا۔ شارلٹ برونٹے اور ان کے فن پاروں پر تفصیلی بات کرنے سے قبل مجھے اپنے قارئین کے سامنے ایک سوال اٹھانا ہے کہ کیا ہمارے اردو ادب میں بھی کسی خاتون کے تحریر کردہ ایسے ناول ہیں جنہیں ہم بھی اردو ادب میں کوئی مقام دے سکیں۔ معذرت کے ساتھ قرۃ العین یا اُنکا آگ کا دریا یا عصمت چغتائی اور انکے ناول افسانے یا اور بڑے نام میرے سامنے نہیں۔ میرا مسئلہ جین آئیر جیسے ناول اسکے پلاٹ، اسکی تھیم اور اُسے ملنے والی بے پایاں شہرت کے حوالے اور ساتھ ہی کم و بیش اُسی نسبت سے تعلق رکھنے والے ناولوں اور اُن سے جڑے اپنے لوگوں کے رویوں اور تعصبات سے ہے۔ جنہیں اپنی چیزوں میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی تا آنکہ باہر کی دنیا کا کوئی بندہ اس کا احساس نہ دلائے۔ نصرت فتح علی خان کی مثال وضاحت کیلئے کافی ہے۔

تو آیئے پہلے ذرا جین آئیر کا سرسری سا جائزہ لے لیں۔ جین آئیر محبت، رومانس، ایک نوجوان لڑکی کے داخلی اور خارجی اثرات کے ساتھ ساتھ ذاتی تجربات پر مبنی ایک اثر انگیز کہانی جس کے واقعات کا بیشتر حصہ اسکے اپنے ماحول کا عکاس ہے۔ حالات کا اُتار چڑھاؤ پڑھنے والے کے جذبات و احساسات پر اثر انداز ہو کر اسے پرتاثیر بناتا ہے۔ فطری رنگ میں ڈھلا ہوا واحد متکلم انداز میں لکھی ہوئی اس نسوانی تحریر میں قاری ڈوب کر بے اختیار اس کا ہر صفحہ الٹتا چلا جاتا ہے۔ یہی وہ خوبی ہے جس نے انیسویں صدی کے تقریباً وسط میں چھپنے والے اِس ناول اور مصنفہ کو اتنا مقبول بنا دیا کہ اسکا شمار کلاسیک میں کیا جانے لگا۔

پروفیسر پہلا ناول تھا۔ بعد میں جین آئیر،

شرلی ایما اور ویلیٹ لکھے گئے۔ شرلی میں بھی کہہ لیجیے کہ شارلٹ برونٹے خود ہے اور صیغہ غائب میں کہانی کا سارا بیانیہ ہے۔ یارک شائر کا ماحول اس ماحول کی ایک سچی تصویر ۔جس میں لوگوں کے معاشرتی مسائل، خاندانی لڑائی جھگڑے، صنعتوں کی وجہ سے بے روزگاری اور بے سکونی کا ماحول سب کی بہترین عکاسی ملتی ہے۔ ویلیٹ Villette میں اس کی اپنی تنہائی، ذات پر داخلی اور خارجی دباؤ ناول میں ہیروئن کا ویلیٹ میں تعلیم کیلئے جانا، کونسٹنٹائن ایثریر ادارے کی تفصیلات، وہاں کا ایک مختلف ماحول۔ یہ سب اس کے ذاتی تجربات تھے۔

اور اب اردو ادب کی جس ناول نگار کا تذکرہ کرنا ہے وہ اے آر خاتون ہیں۔ جن کے ناول شمع تصویر اور افشاں ہیں۔

میں سمجھتی ہوں ان ناولوں نے بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں اتر پردیش (یعنی یوپی) کے شہروں میں اونچے متوسط، متوسط اور نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والی مسلمان اشرافیہ کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل کو جس عمدگی اور خوبصورتی سے لکھ کر محفوظ کیا وہ اپنی جگہ ایک بڑا کارنامہ ہے۔ ایک پردہ نشین عورت اپنے کرداروں کی اندرونی اور اس پر اثرانداز ہونے والے بیرونی اثرات کی بنت، اپنے ماحول اور اپنی روایات کے پس منظر میں اس عمدگی سے بنتی ہے کہ انسانی فطرت کے خیر و شر کے پہلو لیے کچھ ظاہر، کچھ باطنی رخ محبتوں اور نفرتوں میں گندھے سامنے آتے ہیں کہ ہر کردار ذہن پر ایک بھرپور نقش چھوڑتا ہے۔

کہانی اتنی مظبوط کہ بے شمار کرداروں کے باوجود کہیں جھول نہیں۔ ایک تسلسل اور روانی سے آگے بڑھ کر ناول کو حتمی انجام تک پہنچاتی ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ ان تینوں ناولوں میں کوئی بڑا پیغام نہیں۔ انہوں نے کسی بڑے موضوع کا احاطہ نہیں کیا۔ انہوں نے کوئی ماورائی فلسفہ پیش نہیں کیا۔ ہاں رشتے ناطوں میں خاندانی رنجشوں، سیاستوں، توڑ جوڑ، محبتوں، نفرتوں کے جذبات کی فراوانی کے ساتھ انگریز دور حکومت کے نقوش کا بھی ذکر ملتا ہے۔ کہانی کے اندر شادی بیاہ، موت، پیدائش کے مرحلوں میں زندگی کے سبھی رنگوں کو اس کی چھوٹی چھوٹی جزئیات کے ہمراہ بڑی تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اب یہ سب بڑے ادیبوں کو بھلے نہ بھائے اور وہ بے اختیار کہیں کہ یہ کیا رنگوں کا مینا بازار سجا دیا ہے۔ یہ کیا غم کے موقع پر بھی خرافات کا سیلاب امنڈا ہوا ہے۔ مگر حقیقتاً یہ اُس کے اپنے ماحول کی عکاسی ہی تھی کہ اُس دور کا ثقافتی پس منظر ایسا ہی تھا۔

ناولوں کی اِس پیشکش نے اُس مخصوص دور کی مسلم تہذیب و ثقافت کو اوراق میں محفوظ کیا جو تقسیم کے ساتھ زوال پذیر ہو گئی۔

تصویر اور افشاں دونوں ناول بھرپور ڈرامائی تاثر کے حامل ہیں۔ تصویر میں برصغیر کی قدیم داستان گوئی کا رنگ اپنے پورے عروج پر نظر آتا ہے۔ یہاں قاری کا پڑھتے پڑھتے جس طرح سانس رکتا اور اُسے پھرتی سے صفحہ الٹنے پر مجبور کرتا ہے۔ وہ حقیقتاً کمال کا ہے۔ افشاں میں بھی یہ چیز نظر آتی ہے مگر قدرے کم۔

اب ذرا مصنفات کی زندگیوں کا بھی تھوڑا سا احوال بیان ہو جائے۔

یہ انیسویں صدی کی دوسری دہائی کا اختتام ہے جب کاؤنٹی یارک شائر کے شہر بریڈفورڈ کے ایک قصبے ماورتھ میں پیٹرک برونٹے پادری کے گھر **1816** اور **1818** میں شارلٹ اور ایملی برونٹے پیدا ہوئیں۔ ان کی تیسری بہن این برونٹے بھی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لڑکیوں کی تعلیم کا زیادہ رواج نہ تھا۔ تاہم والد چونکہ پڑھے لکھے تھے اس لیے وہ چاہتے تھے کہ انکی بیٹیاں پڑھیں۔ بچپن ہی سے تینوں بہنوں کو پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ جو کتاب بھی ملتی وہ ضرور پڑھتیں پھر اس پر اظہار خیال ہوتا۔ بحث مباحثے سے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو نکھار ملنے لگا تو انہوں نے کہانیاں لکھنا شروع کر دیں۔ آغاز میں یہ کام وہ چھوٹی چھوٹی ڈائریوں پر لکھا کرتیں۔ کاغذوں کو سی لیتیں یوں ایک کتاب بن جاتی۔

تینوں بہنوں نے اب الگ الگ ناول لکھنے شروع کیے اور تینوں نے انہیں لندن کے ایک پبلیشر کو بھیج دیا۔ جس نے دو ناول پسند کیے اور شارلٹ کے ناول کو رد کرتے ہوئے کہا کہ یہ تو بڑا ماٹھا ناول ہے۔

تاہم شارلٹ نے ہمت نہ ہاری اور جین آئیر لکھا اور پبلیشر کو بھیج دیا۔ ناول چھپ گیا۔ اسے غیر معمولی پذیرائی ملی۔ یوں لکھنے کی راہ ہموار ہو گئی۔

اب ذرا اے آر خاتون کو دیکھیے۔ پہلا سوال بھئی یہ کون ہیں؟ چھٹی، ساتویں دہائی تک تو میری طرح بہتوں کو نہیں پتہ تھا۔ ہاں کسی سے اتنا ضرور سُنا تھا کہ پاپولر فکشن لکھنے والی نادرہ خاتون کی والدہ ہیں۔ ہاں بھلا ہو فاطمہ ثریا بجیا کا جنہوں نے ان کے تینوں ناولوں کے ٹی وی سیریل بنائے اور یوں انکے نام کو عوامی سطح پر پذیرائی دی۔ شکل سے تو کوئی بھی واقف نہیں۔ ہاں البتہ اب اتنا سا ضرور علم ہوا ہے کہ اتر پردیش انڈیا کے ایک معزز خاندان سے تعلق تھا۔ ناولوں کا حال بھی کچھ ایسا ہی ہے کہ کہیں اس وقت دستیاب بھی نہیں۔ شاید کسی بڑی لائبریریوں سے کھوج کیا جائے تو کہیں اسکے اردو سیکشن میں گرد آلود پھٹی پرانی صورتوں میں موجود ہوں۔ میرا خیال ہے کہ میری طرح جن لوگوں نے اِن ناولوں کو پڑھا ہے وہ ان کے اندر موجود ایک مظبوط کہانی سے ضرور متاثر ہوئے ہوں گے اور وہ کہانیاں انہیں اب بھی یاد ہوں گی۔

☆☆☆☆☆

نام سے کام تک

شاہدہ دلاور شاہ

دنیا میں دو ہی طرح کے لوگ ہوتے ہیں: ایک محنت سے مزدوری کر کے کمانے کھانے والے اور دوسرے وہ جو دوسروں کی محنت سے اپنا کاروبار چمکاتے ہیں۔ آپ حیران ہوں گے کہ قاضی برکت علی کی سوانح حیات پر مضمون لکھنے کے لیے میں نے ''نام سے کام تک'' کا موضوع کیوں چنا ہے۔ نام تو والدین رکھ دیتے ہیں، رہ گئی بات کام کی، اب کام تو بچے نے بڑے ہو کر خود چننا ہوتا ہے۔ ماں باپ کی محنت بچے پر سات سال تک رنگ لاتی ہے، اب سات سال کے بعد بچے کی خداداد صلاحیتیں نمایاں ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ قاضی برکت علی اس لحاظ سے بھی اسم بامسمّیٰ ہیں کہ وہ ساری زندگی اپنے معاملات میں سارے فیصلے نہایت بہادری، راست بازی اور دلیری سے خود کرتے رہے۔ یعنی زندگی میں ایک اچھے مُنصف رہے - وہ اپنے شاگردوں اور سماج کے لیے باعثِ برکت اور حضرت علیؓ کی مانند بے باک تھے۔

''شجرِ سایہ دار'' قاضی برکت علی کی سوانح حیات ہے، جو ڈاکٹر علی محمد خاں نے تحریر کی ہے، جن کے بارے میں پہلے سے مشہور ہے کہ وہ اپنے طالب علموں کے لیے ایک شجرِ سایہ دار ہیں۔ اگر وہ کسی اور شخص کو یہ

ٹائٹل عطا کردیں تو سمجھ جائیں کہ ان جیسی ایک اور ہستی بھی ہے جو اُن ہی کی طرح علم کے پیاسوں کی اپنی بصیرت کی ٹھنڈی چھاؤں میں علمی تشنگی دُور کرتی ہے۔ اُردو میں ایک محاورہ: ''مٹی کو سونا بنانا'' استعمال کیا جاتا ہے، قاضی برکت علی کی سوانح حیات ''شجرِ سایہ دار'' کے لیے مٹی کو سونا بنانا نہیں جچتا بلکہ اس کے لیے اگر یہ کہا جائے کہ ڈاکٹر علی محمد خاں نے یہ سوانح حیات لکھ کر سونے کو کندن بنایا ہے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔

ڈاکٹر علی محمد خاں تصنیف کی خواہش سے، یقین کی کِل میں فصلِ تازہ اٹھانے کے ماہر شمار ہوتے ہیں۔ وہ پارہ پارہ حرف کو ترتیب دے کر اس کی تمازت سے دائروں میں ہجوم بناتے ہیں تو پھر ان سے فلک کے ستارے تک، احوال آرزو کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

ہر انسان کے کاندھوں پر اپنے پُرکھوں کی سوچ کو آگے بڑھانے کی ذمے داری ہوتی ہے۔ زندگی ایک ہی بار ملتی ہے، کچھ لوگ اپنی محنت، تیقّن اور جہدِ مسلسل سے اس کا حق ادا کرتے ہیں اور کچھ اس خاک کو خاک میں ملا کر چلتے بنتے ہیں۔ اپنے پروں پر ادراک و آگہی کی گرہ لگا کر نشان زدہ پانیوں پر نگاہ رکھنے والوں کو ہی معتبری ملتی ہے۔

ڈاکٹر علی محمد خاں بہت زیرک آدمی ہیں۔ انھوں نے اس سوانح زیست کا آغاز حافظ شیرازی کے اس شعر سے کیا ہے:

یک جو از خرمنِ ہستی نتواند برداشت
ہرکہ در راہِ فنا و راہِ حق دانہ نکشت

.....

یعنی وہ شخص جس نے راہِ فنا و راہِ حق میں ایک دانہ بھی کاشت نہیں کیا، وہ خرمنِ ہستی سے ایک جَو تک حاصل نہ کر سکے گا۔ اس کے بعد شعر و ادب سے شناسائی رکھنے والوں کے لیے آتش کے یہ اشعار لکھے ہیں، جو کہ قاضی برکت علی کی شخصیت پر صادق آتے ہیں:

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے
تھکیں جو پاؤں تو چل سر کے بل، نہ ٹھہر آتش
گلِ مراد ہے منزل میں، خار راہ میں ہے

.....

ڈاکٹر علی محمد خاں نے قاضی برکت علی کی یہ سوانح حیات لکھنے سے قبل اُن کا ایک شخصی خاکہ بھی لکھا مگر تشفی نہ ہوئی، پھر انھوں نے ان کی مکمل زندگی کے تجربات اور حالات کو قلم بند کرنے کا سوچا اور اُس کا پورا پورا حق بھی ادا کیا۔ کسی کی سوانح حیات لکھنا جوئے شیر لانے سے بھی مشکل کام ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ پی ایچ-ڈی سے بھی اگلا قدم ہوتا ہے۔ پی ایچ-ڈی اور خاص کر آج کے دور کی پی ایچ-ڈی میں سکالر کے کئی مفادات برابر میں چلتے ہیں۔ کسی کو اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر لکھوانے کی جلدی ہوتی ہے تو کسی کو پروموشن کی للک ستائے جاتی ہے۔ کسی نے انکری منٹ بڑھانی ہوتی ہے تو کسی کو اپنی ریٹائر

منٹ سے پہلے پہلے اپنی پنشن میں اضافے کا بندوبست کرنا ہوتا ہے۔ سو یہ خواہشات بھی جائز ہیں مگر جو کھوج پرکھ مخلص اور بے لوث ہو کر کی جائے، وہی تحقیق کہلوانے کا حق رکھتی ہے، ورنہ آپ کی ساری محنت محض لفظوں کا ڈھیر ہو کر رہ جاتی ہے، جو جلد یا بہ دیر وقت کی دُھول میں اَٹ جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی قاضی برکت علی سے محبت اپنی جگہ، مگر انھوں نے اس کام کے لیے رات دن ایک کیا اور وہ اس کے لیے قاضی برکت علی کے تمام عزیز و اقارب، شاگردوں اور ان کے عہد کے اُن تمام لوگوں سے بالمشافہ ملے، جنھوں نے اُن کے ساتھ زندگی کا کچھ وقت گزارا یا اُن کے متعلق اپنے بڑوں سے قاضی برکت علی کے بارے میں سُن رکھا تھا۔

''شجرِ سایہ دار'' کا قاری، اس سے صرف قاضی برکت علی کی حیات و واقعات ہی سے مستفید نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے سامنے ایک تاریخی دستاویز کھلی پاتا ہے، جہاں سے تاریخ کا طالب علم بھی فیض یاب ہوتا ہے اور ادب کا بھی اپنے دامن میں حکمت کے موتی سمیٹ کے دم لیتا ہے۔ ڈاکٹر علی محمد خاں نے اس ''شجرِ سایہ دار'' میں امرتسر، جلیانوالا باغ، تحریکِ آزادی، قراردادِ پاکستان، تحریکِ آزادی کے مختلف جلسوں، گولڈن ٹیمپل، قاضی برکت علی اور ان کے قاضی گروپ آف سکولز کے حالات تصنیف کیے ہیں۔ قاضی برکت علی ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں۔ ان کا مطالعہ وسیع تھا۔ ان کے اقوال، اقوال زرّیں کا درجہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے شاگردوں کو صرف علم کے زیور ہی سے آراستہ نہیں کیا بلکہ ان کی تربیت کر کے اُنھیں میدانِ عمل میں اُتارا ہے۔ ایک بار اُن سے کسی نے سوال کیا کہ اگر دوسری بار زندگی ملے تو وہ کیا بننا پسند کریں گے تو آپ نے فرمایا کہ میں معلّم ہی بننا چاہوں گا۔ قاضی برکت علی بچّوں کو اخلاقیات اور روزمرہ زندگی گزارنے کے سادہ اصول سکھاتے تھے۔ یہی سبق، دینِ اسلام اور دنیا کا کوئی بھی مذہب اپنے ماننے والوں کو سمجھاتا ہے۔

روایت ہے کہ کسی شخص کے بارے میں بہت سارے تحفظات تھے مگر کچھ لوگ اس کی بڑی حمایت کر رہے تھے۔ جب یہ معاملہ حضرت علیؓ کے پاس پہنچا تو حسبِ معمول اس کے ساتھیوں نے اُس کی شان میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیے کہ متعلقہ شخص بہت نیک اور صوم و صلوٰۃ کا پابند ہے۔ حضرت علیؓ نے کہا یہ سب تو ٹھیک ہے مگر یہ بتاؤ کہ وہ اخلاقی اعتبار سے کہاں کھڑا ہے، وہ لوگوں کے ساتھ اپنے معاملات میں کیسا ہے، کیا وہ حقوق العباد کی پابندی کرتا ہے؟ اس پر سب خاموش رہے۔ ''شجرِ سایہ دار'' پڑھ کر جہاں ان کے احوال و آثار سے آگاہی ملتی ہے وہاں یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ قاضی برکت علی اپنے بزرگوں کی پیروی کرتے ہوئے طلبہ کو صوم و

صلوٰۃ کا پابند بھی کرتے اور ساتھ ساتھ ان کی بنیاد مضبوط کرنے کے لیے ان کی کردار سازی بھی جاری رکھتے تھے کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ اگر عمارت کی بنیاد کمزور ہو تو بڑے بڑے مینار اور عمارتیں بھی جلد زمین بوس ہو جاتی ہیں۔ نفیس طبیعت کے مالک قاضی برکت علی کی شخصیت میں خود کوئی جھول نہیں تھا۔ اگر اُستاد کی اپنی شخصیت یا کردار میں کوئی کمی یا جھول ہو تو وہ بآسانی اگلی نسلوں میں منتقل ہو جاتا ہے۔ یوں وہ ایک نسل سے دوسری اور پھر مزید معاشرے میں سرایت کر جاتا ہے۔ یاد رہے کہ ذات کا جھول یا قباحت معاشرے میں گئی تو تہذیب برباد ہوئی۔ قاضی برکت علی کی نگاہ میں انسان سے مراد محض مٹی کا بُت اور سماج سے مراد آدمیوں سے بھرا جنگل نہیں بلکہ جیتا جاگتا سلجھا ہوا انسان اور زندہ سانس لیتا ہوا ایسا مہذب معاشرہ ہے جہاں دوسروں کا دکھ درد اپنا سمجھا جائے اور دوسروں کو اپنی خوشیوں میں شامل کر کے سنتِ نبوی کو فروغ دیا جائے۔

قاضی برکت علی نے اپنی عملی وراثت میں نہ صرف بچوں کے لیے بلکہ بڑوں کے لیے بھی دانش و حکمت کے سنہری اصول چھوڑے ہیں۔ وہ ایک جگہ فرماتے ہیں کہ دو لوگوں نے بے کار زندگی کی تکلیف اٹھائی: ایک وہ جس نے جمع کیا اور اس کا استعمال نہ کیا اور دوسرا وہ جس نے علم حاصل کیا اور اس پر عمل نہ کیا۔ اسی طرح ایک اور جگہ استاد کی ماہیت بتاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ معلّم تب تک معلّم ہے جب تک وہ طالب علم ہے یعنی مطالعہ جاری رکھے اور مزید جدید علوم سے آگاہ رہے، اگر ایسا نہیں کرتا تو وہ طالب علم نہیں بلکہ طالبِ موت ہے۔ اُن کی شخصیت بہت سے علمی و ادبی دانشوروں سے مماثلت رکھتی ہے جن میں ڈپٹی نذیر احمد اور سر سید احمد خاں سرِفہرست ہیں۔ اس کے علاوہ وہ صوفی شعرا کو بھی شوق سے پڑھتے تھے۔ انھیں اُن کا بہت سا کلام بھی ازبر تھا۔ وہ بابا فریدؒ، حضرت سلطان باہوؒ، شاہ حسینؒ، بابا بلھے شاہؒ اور میاں محمد بخشؒ کا کلام بہت رغبت سے پڑھتے اور اپنے شاگردوں کو سناتے۔ خاص کر میاں محمد بخشؒ کی تصنیف ''سفر العشق'' تو ان کی جان تھی۔ قاضی صاحب دنیا کی بے ثباتی کو یاد کرتے ہوئے میاں محمد بخش کے یہ اشعار اکثر سنایا کرتے تھے:

گئی جوانی، آیا بڑھاپا، جاگ پیاں سب پیڑاں
ہن کس کم محمد بخشا سونف، اجوائن، ہریڑاں
کوئی آکھے پیڑ اے لک دی، کوئی آکھے پے گئی چک
وچلی گل اے محمد بخشا، اندروں گئی اے مُک

....

مختصر یہ کہ آنے والے لوگ یہ کہیں گے کہ قاضی برکت علی اور ڈاکٹر علی محمد خاں دو شخصیتیں نہیں بلکہ دو عہد ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے طلبہ کو تاریخ سکھائی ہی نہیں بلکہ تاریخ بنائی بھی ہے۔

☆☆☆☆☆

شکیل جاذب کی شعری دنیا

شکیل جاذب کا شمار اردو کے ان باصلاحیت شاعروں میں ہوتا ہے جنھوں نے غزل کی کلاسیکی روایت کو آگے بڑھانے میں نہ صرف اپنی بھرپور تخلیقی قوت، ریاضت اور فنی چابکدستی کا مظاہر کیا ہے بلکہ روایت سے جڑ کر اپنی شاعری کو جدید طرز احساس اور موضوعات کی رنگا رنگی سے ہم آہنگ کیا ہے۔۔ اپنے پہلے مجموعے ''جب سانس میں گرہیں پڑتی ہیں'' سے لے کر نئی آنے والی کتاب ''نمی دانم'' تک وہ شعری دنیا میں ایک ان تھک مسافر کی طرح رواں دواں ہیں۔

شکیل جاذب نہ صرف ایک خوبصورت شاعر ہیں بلکہ وہ اعلیٰ اخلاق اور خوش مزاجی بھی اپنی زندگی کا حصہ بنائے ہوئے ہیں اور وہ ہر وقت اپنے دوستوں میں پیار، محبت اور خلوص کے خزانے بانٹتے نظر آتے ہیں۔

اپنے پہلے شعری مجموعے ''جب سانس میں گرہیں پڑتی ہیں'' میں وہ ایک جرأت مند شاعر کے روپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ وہ اپنی شاعری میں ایک حوصلہ مند فرد کے طور پر دکھائی دیتے ہیں اور ہمیں بھی ہر محاذ پر ڈٹے رہنے کا درس دیتے ہیں۔ شاید اسی لیے اپنے پڑھنے والوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

جاں کے زیاں کو غم کی تلافی سمجھ لیا
کم حوصلوں نے موت کو شافی سمجھ لیا
جاذب نہ جانے کون سی دنیا کا شخص تھا
جس نے سزاؤں کو بھی معافی سمجھ لیا

.....

شکیل جاذب کی غزل میں زندگی کے

محمد نوید مرزا

سارے رنگ موجود ہیں۔ ان کی غزل نئے دور کے سارے تقاضوں کو پورا کرتی ہے جب کہ نظموں میں ایک خاص طرز کی ملائمت اور بے ساختگی ہے۔ پہلے مجموعے میں شامل ان کی زیادہ تر نظمیں محبتوں کے دائروں میں گھومتی نظر آتی ہیں مگر پڑھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ لیکن میری نظر میں شکیل جاذب بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور مجھے ان کی شاعری میں بیک وقت سمندر کی لہروں کا شور، دریاؤں کی روانی، جھرنوں کا بہاؤ اور صحرا کا سکوت محسوس ہوتا ہے۔ ان کے پاس موضوعات کی فراوانی ہے۔ اس مجموعے میں وہ ہمیں ہجر و وصال، غم خوشی، دُکھ سکھ، عصری مسائل اور ظلم کے خلاف ڈٹے رہنے اور ہر وقت کو حوصلوں کو بحال رکھنے کا درس دیتے ہیں۔ اس لیے کہتے ہیں:

مجھ سے کیا چھین سکا تو کہ ابھی تک میرے
پاؤں کے نیچے زمیں سر پہ فلک باقی ہے
یہ معجزہ تو نہیں ہے کوئی خراج ہے اپنی ہمتوں کا
کہ اپنے رستے میں آنے والے تمام کہسار ہٹ گئے ہیں

.....

ہر شخص کا پرکھنے کا اپنا ایک الگ انداز ہوتا ہے لہٰذا عباس تابش انہیں نفیٔ ذات کا شاعر قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں، ''نفیٔ ذات سے ابھرتا ہوا یہ لہجہ میرے نزدیک اس غزل کا لہجہ ہے، جس کی عہد حاضر کو ضرورت ہے۔ میرے خیال میں مضامین نو کے انبار لگانے سے بہتر ہے آدمی اپنے اندر اتر جائے اور ذات کی گہرائیوں سے تمثالیں، مجسم کیفیات اور وہ شاعری نکال کر لائے جو آج کی ضرورت ہے۔ شکیل جاذب میرے نزدیک اس ضرورت کو پورا کر رہا ہے۔ وہ اپنے اندر گہرا اتر گیا ہے لیکن انفرادیت کے مرض کا شکار نہیں ہوا۔''

اپنے اندر گہرا اتر جانے والے شکیل جاذب کی اس کتاب میں پروفیسر محمد ارشد گوہر اور اشفاق ناصر کی رائے بھی درج ہے اور انہوں نے بھی شکیل جاذب کی شاعری کو سراہا ہے اور خراج تحسین پیش کیا ہے۔ میرے نزدیک ''جب سانس میں گرہیں پڑتی ہیں'' نہ صرف اپنے نام کی طرح منفرد اور مختلف ہے بلکہ اس کی شاعری بھی اپنے اندر انفرادیت رکھتی ہے چند شعر آپ بھی ملاحظہ کریں:

ہر قدم تازہ کمک ملتی رہی اپنے خلاف
میرا اپنا ہی عدد میرے علاوہ کون تھا
اس کی بھی مری طرح تھی اک اپنی کہانی
اس کو بھی نبھانا پڑا کردار مجھے بھی
خیر ہو تیری بے نیازی کی
اب نہیں خود پرست تھے بھی اگر
کسے خبر تھی کہ چارہ گروں کے شہر میں بھی
ملے گی زیست ہمیں دور لادوا کی طرح

یہی اثاثہ تھا زندگی کا، یہ خوب ہی تھا مرا سہارا
ترے تغافل کے سنگریزوں سے کرچیوں میں جو بٹ گئے ہیں

.....

شکیل جاذب کا دوسرا مجموعہ ''نمی دائم'' پہلے مجموعے کے تقریباً 17 برس کے بعد اس منظر عام پر آیا ہے۔ اس مجموعے کی بھی دیگر بہت سی خوبیوں کے ساتھ غزل کی کلاسیکی روایت سے ہم آہنگی ہے۔ جس کی طرف جناب افتخار عارف نے کیا خوب اشارہ کیا ہے وہ فرماتے ہیں، ''شکیل جاذب کی کلاسیکی غزل کی روایت سے آگاہی کا اندازہ اس کی پہلی کتاب ''جب سانس میں گرہیں پڑتی ہیں'' سے ہو گیا تھا جو 2003ء میں شائع ہوئی تھی۔ ان دنوں کلاسیکی غزل کی فضا کے نام پر لغتِ شعری کا مصنوعی استعمال رائج کرنے کی کوشش کی جارہی ہے جس کے عام قاری ذرا سی دیر کو اس التباس سے متاثر بھی ہو جاتا ہے۔ شکیل جاذب نے صحیح معنوں میں اپنی روایت کے زندہ سرچشموں سے اکتساب فیض کیا ہے۔''

روایت کے زندہ سرچشموں سے اکتساب فیض حاصل کرنے والے شکیل جاذب کا پہلے مجموعے سے دوسرے شعری مجموعے تک کا سفر زندگی کے بہت سے تجربوں، ریاضتوں، مشاہدوں اور سیکھنے کے بہت سے سلسلوں سے گذرتے ہوئے طے ہوا ہے اور ''نمی دائم'' کے نام سے منظر عام پر آیا ہے۔ شکیل جاذب ہمہ وقت سیکھنے کے عمل سے گزرے ہیں اس بات کا اظہار انہوں نے کتاب میں اپنے لکھے ہوئے دیباچے بعنوان ''سپاس گذاری'' میں معروف شاعر اور اپنے استاد جناب عباس تابش کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے بھی کیا ہے وہ لکھتے ہیں، ''میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے ذاتی زندگی اور شعری تربیت کے حوالے سے عباس تابش باپ جیسا دوست اور استاد میسر ہے۔ عباس تابش کے حاسدین بھی بے شمار ہیں اور اس کے عشاق سے بھی دنیا بھری ہوئی ہے مگر مجھ سے اس کا رشتہ کسی بھی طرح کے دنیاوی سود و زیاں سے ماورا ہے۔''

شکیل جاذب نے سچ لکھا۔ رشتہ وہی مستحکم ہوتا ہے جو دنیاوی سود و زیاں سے ماورا ہو۔ سو آج کے دور میں جب تعلیمی یا شعری اساتذہ کا رشتہ اس قدر مضبوط نہیں رہا، جیسا کبھی ہوا کرتا تھا شکیل صاحب نے اپنے استاد کا احترام کرتے ہوئے انہیں جس انداز میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے اس کے لیے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں اور تابش اس بات کے حق دار بھی ہیں کہ وہ ایک اعلیٰ پائے کے شاعر ہی نہیں بلکہ پرخلوص دوست بھی ہیں۔

شکیل جاذب نے کتاب کے دیباچے میں

اپنے دوسرے دوستوں اور احباب کو بھی خراج تحسین پیش کیا ہے اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے دنیا کے مختلف ممالک میں پڑھے گئے مشاعروں میں شریک ہونے اور دوستوں کو یاد رکھنے کی پوری کوشش کی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنی شریک حیات کا بھی شکریہ ادا کیا ہے، جن کا ان کے شعر و ادب سے جڑے رہنے میں خصوصی اور بڑا کردار ہے۔ یہ سب باتیں شکیل جاذب کے ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اعلیٰ اور باکردار انسان ہونے کی گواہی ہیں۔ میں خود بھی شکیل صاحب کی اس خوبصورت شخصیت کا معترف ہوں ۔چند برس قبل جب وہ پاکستان ملٹری اکاؤنٹس لاہور میں تعنیات تھے تو نہ صرف ان سے ادبی حوالوں سے گفتگو رہتی تھی بلکہ انہوں نے بارہا دفتری مسائل کے حل میں میری مدد بھی فرمائی، جس کے لیے میں ان کا تہہ دل سے مشکور ہوں۔

آیئے اب واپس ''نمی دانم'' کی طرف آتے ہیں۔ کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے یہ خیال بھی آیا کہ شکیل جاذب نے کی سوچ کر اس کا نام ''نمی دانم'' رکھا اگلے ہی لمحے میرے سامنے امیر خسرو کا یہ شعر بھی آ گیا جس میں انہوں نے فرمایا تھا:

زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم
چہ خوش بودے اگر بودے زبانش در دہانِ من

.....

شعر کا ترجمہ کچھ یوں ہے: میرے یار کی زبان ترکی ہے اور میں ترکی نہیں جانتا کیا ہی اچھا ہو اگر اس کی زبان میرے منہ میں ہو۔''

لیکن اس کے ساتھ ایک اور فارسی شعر بھی سامنے آ گیا:

نمی دانم کہ آخر چوں دم دیدار می رقصم
مگر نازم بایں ذوقے کہ پیش یار می رقصم

.....

شعر کا ترجمہ کچھ یوں ہے: مجھے نہیں معلوم کہ آخر دیدار کے وقت میں کیوں ناچ رہا ہوں لیکن اپنے اس ذوق پر میں نالاں ہوں کہ اپنے یار کے سامنے ناچتا ہوں''۔

کچھ نہ جانتے ہوئے بھی جاننے کی کوشش کرنا اور دریار پر رقص کرنا عشق والے ہی جانتے ہیں سو مجھ پہ یہ کھلا کہ شکیل جاذب عشق کی گلیوں کے مسافر ہیں اور وہ نامعلوم سے معلوم تک کے سفر میں جاننے اور نہ جاننے کے درمیان کھڑے اپنے محبوب کو صدائیں دے رہے ہیں۔ وہ کبھی محبت کے سمندر میں کھڑے اس کی لہریں گنتے ہیں تو کبھی صحرائے محبت میں گلاب کھلانے کے آرزومند دکھائی دیتے ہیں۔ اس کتاب میں محبت کے کئی رنگ ہیں

کہیں حاصل تو کہیں لا حاصلی ہے۔ محبتوں کے پھول انہوں نے ''نمی دانم'' میں کئی انداز سے کھلائے ہیں چند مثالیں دیکھیں:

لرزتے ہونٹ کہیں کیا بھلا خدا حافظ
اگر یہی ہے تمہاری رضا خدا حافظ
وہ میرے سانس کی صورت تھا میرے سینے میں
پھر اک دن اس نے اچانک کہا خدا حافظ

.....

اس کی آنکھوں سے مرے خون میں آ ملتی ہے
اک خماری مجھے نشے سے سوا ملتی ہے

.....

سانس رک جائے جو پل بھر بھی ترا دھیان نہ ہو
کار دنیا کے لیے خود کو خفا کون کرے
تجھ سے تسلیم کا رشتہ ہے فقط پیار نہیں
تجھ سے بنتا بھی اگر ہو تو گلہ کون کرے

.....

صدائیں دیں نہ ہمیں یار ہم نکل لیے ہیں
کوئی ہے منتظر اس پار ہم نکل لیے ہیں

.....

میرے نزدیک شکیل جاذب محبت کرنا اور اس میں سفر کرنا جانتے ہیں۔ ان کی شاعری بہت سے موضوعات کے ساتھ عشق اور عشق حقیقی سے بھی جڑی ہوئی ہے اور انہیں اپنے فن سے بھی عشق ہے۔ جس کی طرف محمد حمید شاہد نے کیا خوب اشارہ کیا ہے، ''اپنے فن سے انہیں عشق ہے یہ عشق ہے ان کی شخصیت اور شاعری کو نکھارتا رہا ہے اور مسلسل نکھار رہا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ عشق ایسا ظالم ہے کہ انہیں ایک پل چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تاہم یقین سے کہتا ہو سکتا ہوں کہ وہ اس لگن سے شعر کہتے رہیں گے اور ہم ان کے عشق سے جڑ کر انہیں سنتے رہیں گے اور ان کے کئی اور فراز کی منزلیں اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔''

اللہ کرے فراز کی یہ منزلیں ہمیشہ شکیل جاذب کا مقدر رہیں اور وہ تادیر اپنی خوبصورت شاعری سے ہمارے دلوں پر دستک دیتے رہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ روایت کا احترام کرنے والے اس بے مثال شاعر کے پاس تازگی بھی ہے اور فنی پختگی بھی۔ آخر میں کشور ناہید کی چند سطروں کے بعد تحریر کا اختتام کرتا ہوں وہ فرماتی ہیں، ہمارا شکیل جاذب غزل میں کچھ ایسا نیا پن ڈالتا ہے کہ اس کی غزل غیر مانوس یا پہلے سے سنی ہوئی نہیں لگتی ہے، فرسودہ استعاروں اور موضوعات سے گریز کرتے ہوئے کبھی کبھی حالات سے پریشان ہوتا ہے تو خاک وطن کو خیر کی دعا دیتا ہے''۔

خاک وطن کو خیر کی دعائیں دینے والے شکیل جاذب کے لیے نیک خواہشات اور بہت سی دعائیں۔ سلامت رہیں۔

☆☆☆☆☆

رخشندہ نوید کی نظم ''خوشبو کا کھیل'' کا ایک تجزیاتی مطالعہ

میرے لیے ایک خوشگوار حیرت کا مقام تھا جب محترمہ رخشندہ نوید صاحبہ نے اپنا تازہ شعری مجموعہ ''نیناں اُتریں پار'' عنایت کرتے ہوئے بڑی رسان سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب اس پر کچھ لکھیں۔ میں نے کچھ تامل کیا کہ مجھ ایسا ادب کا معمولی طالب علم اُس شاعرہ کے بارے میں کیا لکھے گا کہ جس کے روشن مستقبل کی بشارت، احمد ندیم قاسمی اور منیر نیازی جیسے شاہیر ادب دے چکے ہوں، ڈاکٹر خورشید رضوی جیسے جید اُستاد نے جسے سندِ فضیلت عطا کی اور جس کے بارے میں بانو قدسیہ برملا کہتی ہوں کہ ''جینے اور لکھنے کا یہ سلیقہ کچھ اتنا عام نہیں''۔ بہر حال تینوں مجموعہ ہائے کلام، ''پھر وصال کیسے ہو''، ''کسی اور سے محبت'' اور ''نیناں اُترے پار'' کے مجموعی مطالعے سے جہاں کچھ عمومی تاثرات مصرع مصرع گہرے ہوتے گئے وہیں کچھ رنگ تتلی کی طرح کھلتے گئے اور ایک سرشاری مشام جاں میں خوشبو کی طرح پھیلتی گئی اور پُرکشش آنکھوں والی عام سی اک شاعرہ'' بڑے وقار اور تمکنت کے ساتھ شہرِ سخن میں رنگ اور خوشبو بکھیرتی نظر آئی۔

رخشندہ نوید کے شعری سفر کا آغاز تو شوخ رنگوں کی بہار سے ہوتا ہے لیکن اب اُس کی ترجیح میں رنگ پسِ منظر میں چلے جاتے ہیں اور خوشبو اُس کی خصوصیت اور خاصیت بنتی نظر آتی ہے، جس کا واضح اظہار رخشندہ کی نظم ''خوشبو کا کھیل'' میں ملتا ہے۔ اس نظم پر تفصیلی بات کرنے سے پہلے رخشندہ کی اپنی شاعری سے کچھ داخلی شہادتیں تلاش کی جائیں کہ خوشبو اُس کا مسئلہ کیونکر ہے؟

کھڑی ہوں میں روضے کی جالی سے لگ کر
میں خوشبو ہی خوشبو، سمیٹے ہوئے ہوں

.....

اُس ایک شخص کی خوشبو میں باغ باغ رہی
جو پھول بن کے مری زلف میں کھلا ہی نہیں

.....

وہ اک خوشبو سا لمحہ جس کو عہدِ زرد نے چھینا
درختوں سے گھرے جنگل میں اُس کو جانِ جاں ڈھونڈیں

کوثر محمود

ہمیں منتظر خوشبوؤں کے تھے ورنہ
کوئی رُت سہانی ابھی کب ہوئی تھی

.....

مرے گلشن سے کم کرنا شکایت
تو خود خوشبو کی چال آیا نہیں تھا

.....

پھول، کلیوں، چاند، تاروں، ساحلوں کا نام لوں
تتلیوں، پریوں، پرندوں، خوشبوؤں کا نام لوں

.....

اب تک میری ہر پور سے ہیں پھول بکھرتے
آنچل کبھی خوشبو کی اڑانوں میں اڑا تھا

.....

میں اُس کے ساتھ بہت دور تک مہکتی گئی
تمھاری یاد بھی جیسے ، ہوا بہار کی ہو

.....

سبھی الماریوں میں، ہینگروں میں، اُترے کپڑوں میں
جو تھی کولون کی خوشبو، اڑا دی ہے ہواؤں نے

.....

آیئے ملتے ہیں رخشندہ نوید سے کہ ''جس کی شاخِ تن پر لباس کی شوخی بھی گلاب کی صورت کھلتی ہے'' ..... وہ رخشندہ کہ جس کی روح گلابوں کی مہک سے سرشار ہے لیکن کانٹوں میں تنہا کھڑی''۔ ''سرخ گلابوں کی خوشبو کو زیبِ تن کرتی اور موتیے کی کلیوں کو اپنے سر پر وارتی ہوئی رخشندہ'' ..... ''وہ رخشندہ کہ، ''جب وہ سنتی ہے کہ اُس کے محبوب کے شہر میں برف پڑ رہی ہے تو وہ کچی کیری کی خوشبو سے ملتا جلتا سبزہ مائل رنگت کا دوشالہ ڈھونڈنے نکل پڑتی ہے کیونکہ یہ رنگ اُسے کسی کی آنکھوں کی یاد دلاتا ہے۔''

آمدم برسرِ مطلب.....

اگرچہ خوشبوؤں کے جہانِ اَسرار کے بارے میں مکمل آگاہی محالات میں سے ہے لیکن اوراقِ سابق میں پیش کردہ معروضات سپاس نظامِ زندگی میں خوشبوؤں کے ایک منفرد کردار کا ایک مبہم سا خاکہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس عالمِ اسرار کو بیان کرنے کے لیے رخشندہ نوید نے ایک جامع عنوان کا انتخاب کیا ہے جس میں اسرار تحیّر، وسعت کے ساتھ ایک انتہائی پیچیدہ صناعی ایک لازمی جبری نظام کے تحت ٹھیک ٹھیک کام کر رہی ہے۔ ذرا پہلا مصرعہ تو دیکھیے:

خیالوں کی دنیا کے بے خواب رستے

آپ نے چاہے جتنا خوبصورت خواب دیکھا ہو، طویل ہو یا مختصر، جب اُسے بیان کرنے لگیں تو پتہ چلے گا کہ اُسے ایک فیصد بھی بیان نہیں کر پائے بالکل اُسی طرح کسی خوشبو کو کتنا ہی شرح وبسط کے ساتھ بیان کرتے جاؤ تو عجز کلام حرف حرف جھلکنے لگتا ہے اور انسان یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ (اپنے مدرکات کی تحدیدات کے ساتھ) خوشبو کو صرف محسوس کیا جا سکتا ہے اور اس کا کالم بیان نا ممکن ہے۔ خوشبو اور خواب میں بھی یہی مماثلت ہے کہ کوئی ان کو روم روم سے محسوس کرے تو کرے لیکن جب ان کو لفظوں کا جامہ پہنانے کی کوشش کی جائے تو یہ کسی اور ہی پیکر میں ڈھل جاتے ہیں،

اچھے اچھے خواب دیکھنے کے لیے پُرسکون نیند شرط اوّل ہے اور من چاہی خوشبو، اور کسی من بھاونے کی مہک بھی میسر ہو تو اور کیا چاہیے! لیکن خوشبو سے خالی، بے خواب راتیں شاید ادیبوں شاعروں کا مقدر ہیں۔

کسی شے کو سلیقے سے بیان کرنے کے لیے مناسب الفاظ کا چناؤ اور ان الفاظ کو مہارت سے برتنا ہی شعری دستگاہ کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ رخشندہ نے پہلے مصرعے، ''خیالوں کی دنیا کے بے خواب رستے'' میں لفظ خیال کو باندھ کر عنوان کو حتی الامکان گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔ لفظ خیال ''خیل'' سے نکلا ہے جس کے ایک معنی بادل کے بھی ہیں اور جس طرح بادل ہر گھڑی اپنی شکلیں بدلتے رہتے ہیں اسی طرح خواب و خیال اور خوشبو بھی کبھی کسی یکساں حالت پر نہیں رہتے سو رخشندہ کا ہر لمحہ بدلتی ہوئی زندگی کا ہمہ جہتی سے تطابق (Synchronizaiton) پیدا کرنے کے لیے خوشبو کو خیال اور خواب سے تعبیر کرنا سادگی و پرکاری کی عمدہ مثال ہے۔ دوسرا مصرع دیکھیے:

کوئی آواز چاہے کیسی ہی بے معنی کیوں نہ ہو، ہماری توجہ کو فوراً اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اور ہم صرف اُسی کے بارے میں سوچنے لگتے ہیں بھلے وہ کتنی ہی غیر اہم کیوں نہ ہو لیکن وہ ہمارے گیان دھیان اور استغراق میں خلل ڈال دیتی ہے اور جب مکمل خموشی ہو تو پھر معاملات کی گہرائی اور گیرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔

آپ نے غور کیا ہو گا کہ جب ہم بالکل خاموش ہو کر کسی طرف دھیان لگاتے ہیں تو غیر محسوس طریقے سے ایک وسعت اور کشاد ہمارے سینے میں بھرتی چلی جاتی ہے اور یہی رائے صائب ہے کہ خموش رہ کر ہی انسان کو اپنی ذات کا عرفان حاصل ہو سکتا ہے اور خواب، شاعری اور روح وغیرہ اسی بالائے حسیات مشاہدے (Extra Sensory perception) کی ذیل میں آتے ہیں:

میں چلتی رہی ہوں ہوا کی طرح
مست قدموں کی جھنکار کی آرزو میں

.....

زندگی کے بہاؤ کو ہوا کے جھونکے سے تعبیر کرنا کیا ہی اچھی کاوش ہے، لیکن دوسرا مصرع، ''مست قدموں کی جھنکار کی آرزو'' بظاہر اُکھڑا ہوا نظر آتا ہے، اس مصرعے کو خوشبو سے کیسے Corelate کیا جائے؟ ایک توجیہہ یہ ہو سکتی ہے کہ پاؤں میں مہندی لگی ہوئی ہو اور مہندی کی ہلکی خوشبو سے مرد اور عورت کے درمیان مستقل سماجی گرہستی کے بندھن کی طرف اشارہ ملتا ہے:

یہ بے نام خوشبو، یہ گھنٹی مرے دل میں بجتی رہی ہے
یہ دھڑکن مرے لب پہ بجتی رہی ہے
یہ بے نام خوشبو وہ جھونکا نہیں ہے

یہ بے نام خوشبو وہ جھونکا نہیں ہے
نہ میرے مسیحا کی آواز پا ہے

.....

بے نام خوشبو کو فیرومون کے تناظر میں دیکھیں تو ایک شدید قسم کی Discontentment بے اطمینانی اور اضطراب کا عکس جھلکتا ہے اور شاعرہ کسی مسیحا کی آواز پا کو ترس رہی ہے۔ لفظ مسیحا (بمعنی مسح کیا گیا) اپنے اندر ایک جہانِ معنی رکھتا ہے۔ یہودیوں میں رواج تھا کہ بادشاہ کی تاج پوشی کے وقت اُس کے سر پر مقدس تیل کا مسح کیا جاتا تھا (یعنی اُس کے سر پر مقدس تیل ملا جاتا تھا) اور چونکہ یہودی اپنے کسی موعود بادشاہ کے منتظر تھے لہٰذا حسبِ دستور حضرت عیسیٰؑ کے لیے مسیحا کا لقب اختیار کیا گیا (یعنی مسیحا "مسح کیا گیا" یا اصطلاحاً "جسے خدا کی طرف سے بادشاہی دی گئی" اور حضرت عیسیٰؑ کے معجزات میں بیماروں کو شفا دینا، کوڑھیوں کو بھلا چنگا کر دینا شامل تھا لہٰذا یہ لفظ اپنے بھرپور تلازمے کے ساتھ یہاں برتا گیا ہے۔

رخشندہ اپنے باطنی کرب، ظاہرہ دکھوں اور تمام Aliments سے نجات کے لیے کسی مسیحا کے "لمسِ معجز نما" کی منتظر ہے یہ لمس کسی انسان کی شکل میں بھی ممکن ہو سکتا ہے اور شاعری کی تجسیم کی صورت میں بھی ممکن ہے۔ دُکھ، تنہائی، کرب، اضراب تخلیق کے لیے مہمیز کا کام کرتے ہیں بقول شعیب بن عزیز:

تنہائی کے دوزخ سے بھی گزرا ہوں میں لیکن
بے لطف رفاقت کا عذاب اور ہی کچھ ہے

.....

لیکن منیر نیازی نے کیا پتے کی بات کہی کہ شاعر ایک زندگی پر قناعت نہیں کر سکتا، نئے نئے امکانات کی، خواہش، طلب اُسے بے چین رکھتی ہے۔

میں خوشبو کے ہاتھوں میں کھیلی بہت ہوں
میں اب بھی اکیلی اکیلی بہت ہوں

.....

اگرچہ DNA کی رو سے ہر انسان ایک دوسرے سے مختلف ہے لیکن وہ اپنے ہم جنسوں سے ایک یگانگت اور موانست کے رشتے میں بندھا رہتا ہے اور جب اُسے اپنی انفرادیت کا ادراک ہو جاتا ہے تو وہ ایک طرح کی جبری تنہائی کا شکار ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کو اکیلا اکیلا سمجھنے لگتا ہے جیسے رخشندہ کہتی ہے: جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے رب کو پہچان لیا۔

بہر حال رخشندہ نوید صاحبہ آپ کو نئی کتاب کی مبارک باد اور آپ شہرِ سخن میں اسی طرح مصرع مصرع خوشبو بکھیرتی رہو۔ آخر میں حافظ شیرازی کا ایک شعر آپ کی نذر:

خیالِ خالِ تو، با خود، بہ خاک خاہم بُرد
کہ تازِ خالِ تو خاکم شود ..... عبیر آمیز

☆☆☆☆☆

اکیسویں صدی کی نمائندہ کلیات

نسیمِ سحر کا شمار ان شعرا میں ہوتا ہے جو جدید اردو غزل کے منظر نامے کو کلی طور پر تبدیل کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، ان کا شعر بیانیہ ایک الگ تسلسل کے ساتھ نئی شعری متھ تخلیق کرتا ہے، ایک نئی شعری متھ دراصل ہماری ایک نئی سماجی تبدیلی ہے، زبان و بیان کا ایسا استعمال کم کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ عہدِ جدید کی شاعری کے تقاضے بھی نئے ہیں، نسیمِ سحر کی شاعری میں فرد اور سماج کے تمام مسائل کو ہمیشہ دخل رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاعری کو اگر ''جزو زیست از پیغمبر'' تسلیم کرلیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ شاعری واقعتاً پیغمبرانہ وصف ہے، پیغمبری ہے۔

پیغمبر، تینوں زمانوں کے مسائل سے کلی طور پر آگاہ ہوتا ہے، شاعری بھی ایسے ہی تینوں زمانوں سے آگاہ ہوتی ہے اور فرد کو آگاہ کرتی ہے، اب یہ شاعر کی توفیق پر منحصر کرتا ہے کہ شاعر کس طرح اپنے ادراک اور علم سے اپنے عہد کے مسائل کو اپنی شاعری میں تصویر کرتا ہے۔

نسیمِ سحر صاحبِ معروف شاعر ہیں، انھوں نے اپنے ادراک اور گہرے فکر و تدبر سے ہمارے عہد کے مسائل کو اپنی شاعری کی زبان بنایا ہے۔ اسلوب ایسا سادہ ہے کہ ان کے تخلیق کیے ہوئے حرف حرف میں گہرائی موجود ہے، ایسا اسلوب کوئی صاحب زبان اور صاحبِ اسلوب فنکار ہی اختیار کرسکتا ہے۔ اصل میں تو بات کرنے کا ایک ہنر ہوتا ہے، ڈھنگ ہوتا ہے، ہر شاعر اپنی شاعری اور اپنی زبان ساتھ لے کر آتا ہے، یہی شعر کہنے کا ہنر ہوتا ہے جو شاعر کو ممتاز اور منفرد کرتا ہے۔

نسیمِ سحر قادر الکلام شاعر ہیں کہ انھوں نے جہاں اپنی نئی زبان وضع کی ہے وہاں پر انھوں نے مضامین نو کے انبار لگا دیے ہیں میرے خیال میں نسیمِ سحر سے اس سے کم کی توقع ہی نہیں جاسکتی:

قید کی اک قسم آزادی بھی ہے
توڑ دوں یہ حلقۂ زنجیر کیا؟

اسد عباس خان

جس تیقن سے انھوں نے اس شعر میں قید کو آزادی کی معنویت عطا کی ہے، یہ ان کی قادر الکلامی کی دلیل ہے، واقعتاً معنویت بھی ایسی ہی پیدا کر دی ہے گہرائی اور فکری گیرائی کے ساتھ۔ نسیم سحر شعر کہتے ہیں۔ یہ نسیم سحر کی بصیرت ہے جس سے وہ دیکھتے ہیں اور شعر کہتے ہیں۔ بصیرت سے اگلا درجہ فراست ہے جیسا کہ حدیثِ نبوی ہے کہ 'مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے'' نسیم سحر نے بصیرت اور فراست کو یکجا کر دکھایا ہے تب ہی تو ایسے ایسے شعر کہے ہیں کہ عقل حیرت میں پڑ جاتی ہے اور انھوں نے اپنی شعریات میں اپنے پورے عہد کا احاطہ کیا ہے، مذہب، سماج، سیاست، تہذیب، محبت، ادب غرض تمام بڑے موضوعات پر لکھا ہے۔ بڑے موضوعات پر بڑے فنکار کی نظر ہوتی ہے اور وہ اجتماعی مسائل کو اپنے ذاتی مسائل بنا کر پیش کرتا ہے:

مجھے یہ ڈر ہے کہیں ٹوٹ ہی نہ جاؤں میں
درونِ ذات قیامت بپا ہی ایسی ہے

درونِ ذات قیامت کا بپا ہونا۔ قومی اور ملی مسائل پر نسیم سحر کے دل میں بلا کی بے چینی اور اضطراب اور کرب کی علامت ہے، کہ نسیم سحر، پل پل اس اذیت گزرتے ہیں۔ کلیاتِ نسیم سحر ہمارے عہد کی ایک نمائندہ کلیات ہے جس میں نسیم سحر نے جدید اردو غزل کو ایک نئے ذائقے سے آشنا کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں نسیم سحر کا 'کل کلام' شامل ہے مگر یہ جدید اردو غزل کا ہی 'کل کلام' ہے۔ اس لحاظ سے کہ انھوں نے اپنے ہر شعر میں ایک نئی شعری فضا قائم کر دکھائی ہے اور ایسا کرنا سبھی شعرا کے بس کا کام نہیں ہے کیونکہ:

ہاتھ گھل جاتے ہیں تب کوزہ گری آتی ہے
(عباس تابش)

سو، نسیم سحر کی شعری تہذیب میں آج کا انسان پوری طرح ظاہر ہو رہا ہے۔ آج کے انسان سے مراد نیا انسان ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اب ہماری شاعری کو بھی ہر لحاظ سے نیا ہونا چاہیے، جیسا کہ کلیاتِ نسیم سحر کی شاعری ہے۔

اس شاعری کا ابلاغ ہی ایک معجزہ اور کارنامہ ہے، ہر لفظ سے قاری تک ایک نیا مفہوم اور شعور ترسیل ہو رہا ہے، ذہین شاعر کا کام ہی یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہدے سے مخاطب ہوتا ہے اور اپنے پورے عہد کی زبان بن جاتا ہے نسیم سحر نے اس عہد کا حرف بہ حرف وسیع تر مطالعہ کیا ہے اور مشاہدات کی رو سے اس عہد سے مخاطب ہوئے ہیں۔ مذہبی، سیاسی، سماجی اور ادبی مطالعے سے انھوں نے اپنی شعریات کو بھر دیا ہے:

مسافت خیر مقدم کر رہی ہے
نظر ہے سایۂ دیوار پر بھی

مرا قبیلہ ہے کس انتہا کا سادہ دل
اماں سمجھتا ہے یہ اپنی بے پناہی کو
کہیں یہ خواب کا منظر ہی سچ نہ ہو جائے
کہ ناؤ ڈوب چکی، بادباں باقی ہے

.....

نسیم سحر کے ہاں صحیح معنوں میں مضامین کا تنوع ہے۔ متنوع مضامین کو انھوں نے اپنے الگ انداز سے برتا ہے، اور 'مضامینِ نو' کے انبار بھی لگا دیئے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ ان کا فکری سفر کئی دہائیوں پر محیط ہے اور وہ برصغیر کے استاد شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں اس لیے کلیاتِ نسیم سحر کی انفرادیت معاصر شاعری میں مسلم ہے۔ کیونکہ نسیم سحر امیجز کی تازگی، نئی نکتہ آفرینی، آفاقی معنویت، شعر کی نئی تکنیک اور اپنی فکری وسعت اور گہرائی کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ ان کی شاعری شعور سے لاشعور تک کا سفر اسی تناظر میں کرتی ہوئی نظر آتی ہے اور ایک نئی شعری جہت کو دریافت کرتی ہے:

ذہن پر پھر نزولِ شعر ہوا
میری محرومیوں نے پائی زباں
قلم کی نوک نے دل کے گہر سمیٹ لیے
وہ شعر اشک بنے ہیں جو میں بہا نہ سکا

.....

نسیم سحر کی شاعری کسی اور ہی راستے، نئے راستے پر لے کر نکل جاتی ہے۔ جیسے حیرت ہو، کشف ہو اور عرفان ہو، ایسے ہی نسیم کی شاعری کے دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں، اور وہ سماج کی محرومیوں کو اپنے لفظوں اور شعروں میں زبان دیتے چلے جاتے ہیں۔

کلیاتِ نسیم سحر، ہمارے عہد کا چہرہ ہے۔ یہ چہرہ ذاتی بھی اور کائناتی بھی ہے:

خرابے ختم ہوتے ہیں جہاں پر
وہاں سے ابتدا اس شہر کی ہے
دیئے اس تیز رفتاری سے بجھتے جا رہے ہیں
ہوائے شہر کو بھی نوحہ خوانی آ گئی ہے

.....

نسیم سحر کی شاعری میں عصر موجود کی بڑی شاعری کے آثار موجود ہیں۔ لسانی تازہ کاری بھی ہے اور نئی معنوی تشکیل بھی نسیم سحر کی شاعری کا اختصاص ہے۔ آج، اس وقت جہاں کونے کونے سے شاعری کی آوازیں آ رہی ہیں، وہاں نسیم سحر کی شاعری الگ تھلگ سنائی دے رہی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد کی شاعری میں جو معدودے چند بڑے نام ہیں۔ نسیم سحر کا نام ان میں سرفہرست ہے کہ جناب نسیم سحر نے اپنی ''نوری توفیق'' کے ساتھ جدید اردو غزل کو ایک نئی پہچان عطا کی ہے اور اپنی انفرادیت قائم کی ہے۔ غزل کا جو منظر نامہ انھوں نے تشکیل دیا ہے، بجا طور پر جدید اردو غزل کی تاریخ اس پر نازاں ہے اور نازاں رہے گی کلیاتِ نسیم سحر، نئی شاعری کی کلیات ہے، نئی شاعری

کی تعریف نئی شاعری کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتی۔ نسیم سحر، نئے عہد کے آدمی ہیں سو ان کی شاعری بھی نئے عہد کے آدمی کی شاعری ہے اور نئے عہد کے آدمی کے لیے ''شاعری'' ہے کلیاتِ نسیم پڑھنے کے بعد یقین ہو جاتا ہے کہ غزل میں ایسا کام نسیم سحر کے علاوہ کوئی نہیں کرسکتا جو انھوں نے کر دکھایا ہے!!!

زبان و بیان کے حوالے سے بھی یہ شاعری معاصر شاعری سے بہت آگے نکل گئی ہے اس میں کوئی دوسری رائے نہیں ہوسکتی کہ شاعر زبان کا محتاج نہیں ہوتا۔ شاعر تو نئی زبان بناتا چلا جاتا ہے اور صاحب اسلوب فنکار کا اسلوب بنا کر پھر اسے توڑنے پر بھی قادر ہوتا ہے اور نئے اسلوب کو اپنے اسلوب سے جوڑنے پر بھی قادر ہوتا ہے۔ زبان کے مروجہ اصول اس کی شاعری میں خود بخود ڈھل جاتے ہیں، نسیم سحر کی غزل میں بھی ایسا ہی ہوا ہے کہ ان کی شعری زبان، کلیات نسیم سحر کی زبان ہی ایسی ہے انھوں نے جو زبان وضع کی ہے یہ جدید اردو غزل کو ثروت مند بنا رہی ہے۔ زبان و بیان کا ایسا احتیاط خال خال ہی نظر آتا ہے کیونکہ نسیم سحر کی زبان ایک عام آدمی کی بھی زبان ہے اور سماج کے ایک بہت اعلیٰ تعلیم یافتہ آدمی کی بھی زبان ہے۔

کم از کم میری نظر میں لفظ کا ایسا نادر استعمال نسیم سحر کی شاعری کے علاوہ کہیں نہیں گزرا۔ میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ بڑی شاعری کی زبان ایسی ہی ہونی چاہیے، اسلوب ایسا ہی ہونا چاہیے۔ دیکھنا تو یہ ہوتا ہے کہ شاعر الفاظ کو کیسے استعمال کرتا ہے۔ زبان سے سہولت کے ساتھ کام لیتا ہے کہ توڑ پھوڑ کا کام کرتا ہے۔ کلیات نسیم سحر کی زبان بہت شائستہ ہے جو ہر لحاظ سے نئی زبان بھی ہے اور اردو زبان بھی ہے:

شہر کے شور میں کس کس کو سماعت کیجیے
یہی کافی ہے اگر اپنی صدا آ جائے

.....

شاعری کے شور میں، نسیم سحر کی آواز پوری انفرادیت کے ساتھ سنائی دے رہی ہے۔ کلیات نسیم سحر کی معجز آفرین شاعری حرف حرف ایک جدید تر معنوی تفہیم کی دستاویز ہے۔ یہ انوکھی شاعری ہے، ولی دکنی سے لے کر، تاوقتیکہ، اتنا تازہ اور نادر انداز بیان ہی کم شعرا کو قدرت نے ودیعت کیا، نسیم سحر کی کلیات پوری گواہی دے رہی ہے، بڑی شاعری کے نمونے اور آثار تلاش کیے جاتے ہیں۔ کلیات نسیم سحر کا ورق ورق کھلا ہے کہ یہی شاعری ہی جدید اردو شاعری کا 'عہد نامہ جدید' ہے اور بجا طور پر نسیم سحر نئی غزل اور شاعری کے نقش گروں میں سرفہرست اور نمائندہ شاعری ہیں اور ان کی کلیات اکیسویں صدی کی نمائندہ کلیات ہے۔

☆☆☆☆☆

حاجی بشیر احمد بشیر کی پنجابی شاعری

ساہیوال شہر علم و ادب کے لحاظ سے زرخیز رہا ہے۔ یہاں ادب سے پیار کرنے والے اور اس کو پروان چڑھانے والے ہر دور میں ہی موجود رہے ہیں۔ اسی لئے یہ خطہ "شہر غزل" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ جن لوگوں نے ساہیوال کا نام بلند کیا ان میں مجید امجد، ڈاکٹر الف۔د۔ نسیم، منیر نیازی، طارق عزیز، حاجی بشیر احمد بشیر، ڈاکٹر خورشید رضوی اور ڈاکٹر سہیل احمد خان اہم ہیں۔

ہوش سنبھالتے ہی جن شخصیات کا ذکرِ خیر گھر میں کثرت سے سنا ان میں سے ایک حاجی بشیر احمد بشیر (مرحوم) بھی ہیں۔ حاجی صاحب بلاشبہ ساہیوال کا اثاثہ ہیں۔ ان کا مزاج درویشانہ تھا۔ بے شمار لوگ ان سے فیض حاصل کر چکے ہیں اور اس بات پر نازاں ہیں۔ حاجی صاحب کے مجموعہ کلام میں قوس خیال، بات تری ورق ورق، اپنے ساہ دا سیک، رختِ نوا اور شعری کلیات "کلیات بشیر" شامل ہیں۔

حاجی صاحب کا ہمارے گھر بہت آنا جانا تھا۔ میں چونکہ عمر کے اس حصے میں تھی جس کو بچپن کہتے ہیں، تو ان سے براہ راست کوئی ملاقات نہ ہو سکی۔ اب جبکہ ان کے کلام کا مطالعہ کیا تو یہ دکھ شدت اختیار کر گیا کہ میں کیوں نہ ان سے مل سکی؟ ان کی شخصیت کا جائزہ ان کا کلام پڑھ کر لگایا۔ یوں تو ان کا سارا کلام ہی لاجواب ہے لیکن نہ جانے کیوں ان کا پنجابی کا کلام مجھے میرے دل سے زیادہ قریب لگا۔ آیئے ان کے پنجابی کلام کا کچھ حصہ ملاحظہ فرمائیں:

سیدہ آمنہ ریاض

بولن تگڑے اگے کی
منگن حق وچارے کی
ماڑے اتے ظلم بغیر
ظالم دے ہے پلے کی
باہر ہو گئے جامے چوں
ہتھ آئے دو پیسے کی

.....

اورایک خوبصورت شعر:

رزق دی ڈور نہ دنیا ہتھ
لگنا دنیا تھلے کی

.....

ان کے پنجابی کلام میں زبان کی چاشنی، برجستگی، مٹھاس، گھلاوٹ، نغمگی الغرض سب کچھ تو ہے جو اہل زبان کا خاصہ ہے۔ پنجابی کلام میں خاص طور پر ردیف "کی" کا استعمال جا بجا کیا گیا ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔ مزید کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

کھیراں حلوے منڈے کی
درویشی وچ چسکے کی
لگ گئے لوکی چاہواں تے
دائیاں دانے بھننے کی
اٹھن بین عذاب بشیر
بوڑے ہو گئے گوڈے کی

.....

ان کا کلام پڑھیں تو عصر حاضر کی شاندار تصویر کھنچتا نظر آتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ آنے والے دنوں کے حال سے بھی واقف تھے کہ ان کا ہر شعر موجودہ ماحول کا عکاس نظر آتا ہے۔ چند مزید اشعار ملاحظہ ہوں:

ہے دس اپنے پلے کی
میلے آپاں جایئے کی
اک دوجے دے کانے سبھ
کوئی کسے نوں آکھے کی
تابعداری بیبا سکھ
نوکر کی تے نخرے کی
ٹھواں اے جو خصلت وا
اوہدے تے کوئی وسے کی
کل اونہوں بخشاون گے
ماڑی محل مربے کی
ظالم دے کم آون گے
حج نمازاں، روزے کی
شہر اچ اپنا کون بشیر
ساڈا مان کسے تے کی

.....

آخر میں دعا گو ہوں کہ رب تعالیٰ حاجی صاحب کے درجات بلند فرمائے۔ آمین اختتام حاجی صاحب کے ان اشعار پر کروں گی:

ماڑا چنگا جو وی ہے ساں یارو چیتے رکھنا
خوشیاں نال ہنڈاو عمراں سجنو چیتے رکھنا

☆☆☆☆☆

نیند سے بیدار ہوا

عائشہ احمد جاوید

اللہ پاک نے انسان کو اشرف المخلوقات بنا کر بھیجا ہے۔ یعنی وہ اس کا خلیفہ اور نائب ہے۔ آدم اور حوا کی اولاد ہے۔ جب بچہ اس دنیا میں آتا ہے تو اس کی خوشیاں منائی جاتی ہیں اور اگر اولاد بیٹا ہو تو اس کا اظہار منفرد اور بہترین انداز میں ہوتا ہے۔ شروع ہی سے لڑکا اور لڑکی میں فرق بتا دیا جاتا ہے۔ کھانے کی مقدار سے لے کر ترجیحات فرق اور رویوں میں تقسیم دولت کی غیر منصفانہ تقسیم اس کے ساتھ رہتی ہے۔ اس کو بتا دیا جاتا کہ تم لڑکے ہو۔ اور چنانچہ تم لڑکے ہو اس لیے تم کچھ بھی کر سکتے ہو۔ اگر وہ کسی لڑکی کو چھیڑ رہا ہے تو اس کی ہنس کر حوصلہ افزائی کی جاتی ہے اور اس کی مردانگی کا اعلان کیا جاتا ہے۔

اس کے برعکس اگر کسی لڑکی بری نظر سے دیکھ لیا تو اس پر سو سو پابندیاں لگا دی جاتی ہیں یا پھر اس کی شادی کر دی جاتی ہے۔ یا اس میں خرابی نکالی جاتی ہے اور شک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ لڑکی کو گھر سے نکلنے سے پہلے یہ کہا جاتا ہے بیٹا زمانہ بہت خراب ہے۔ خود کی حفاظت کرنا تم اکیلی باہر نہیں نکلو پورے خاندان کی عزت تمہارے ساتھ جا رہی ہے۔

اس لیے ہمیں شکایت کا موقع مت دینا۔ یہ نہیں کہا جاتا کہ تم بااعتماد ہو کر گھر سے باہر جاؤ۔ اگر تمہیں کوئی کچھ کرے تو ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ ڈرنا نہیں بہت کم والدین ایسے ہیں جو اپنی بچیوں کا ساتھ دیتے ہیں۔ اعتماد دیتے ہیں تو ان کو معاشرے میں آزاد خیال اور مشکوک نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ محفوظ رہے بھی نہیں رہتی۔

ان دونوں مختلف صورت حال میں بس فرق یہ ہے کہ ایک میں اعتماد اور حوصلہ نہیں دیا جاتا اور صورت حال میں اعتماد دیا جاتا ہے۔ اور جس میں اعتماد دیا جاتا ہے تو ایسی خواتین گھر سے اکیلی جب باہر نکلتی ہیں تو اپنی نوکری، ضروری کام یا کسی مجبوری کے تحت تو ان کو زیادتی، ڈرانے، دھمکانے اور تشدد کا کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

اگر بات مردوں کے ان کے ساتھ ہونے کی لازم ہو تو ایسے درندوں کو مردوں کے ساتھ بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بلکہ وہ درندے مردوں کے سامنے ان کی عورتوں کی عزت پامال کرنے میں دیر نہیں کرتے ریاست مدینہ میں ایسی ہی ایک خاتون کا افسوسناک واقعہ پیش آیا۔ جس سے پاکستان کی عوام کو نہایت دلی صدمہ پہنچا۔ تو دکھ تو اس بات کا ہے کہ اس دکھ کا ازالہ بھی ممکن نہیں۔ پھر بھی تشنگی رہے گی۔ کسک رہے گی۔ بچوں کی زندگیاں برباد ہو گئیں۔ مستقبل برباد ہو گئے۔ وہ معاشرے میں دوبارہ خود کو سنبھال کر نکل نہ سکے گی۔

افسوس ----------

ہائے افسوس ----------

صد افسوس ----------

شرمناک واقعہ پیش آیا ہے۔

یوں تو اس واقعے اور اس طرح کے کئی واقعات میں بہت سے لازمی جز ہیں جس میں ایسے درندے یہ بدفعلی کرتے ہیں اور آخر کار وہ اس عمل تک تیار ہو جاتے ہیں مگر بات ہمیشہ گھر سے شروع ہوتی ہے۔

ہمارے ماحول اور تربیت کا نہایت اہم کردار ہے۔ تربیت کے زمرے میں لڑکوں کو کافی چھوٹ دی جاتی ہے۔ ماحول میں جاہلیت، تشدد، بے انصافی، غلط رویہ اور اختیارات کا غلط استعمال سٹیٹس کا فرق خود غرضی اخلاقیات سے گرتا غربت اور عورتوں کا خاص طور پر ماؤں کا لڑکوں کو ہوا دینا۔

نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے اس کو شے دینا یا نہ دینا اس میں والدین کا اہم ترین ہاتھ ہے۔ اس کو غلطی کرنے پہ تھپڑ مارنے کے بجائے اس کے لڑکے ہونا پر اترانا باپ کی مار سے بچانا یہ چیزیں آہستہ آہستہ گھر سے شروع ہو کر اس کی ذہنی تربیت کو مضبوط کرتی ہیں۔ کھلم کھلا گفتگو اخلاق اور رشتوں کا احترام ماں ہی سکھاتی ہے۔

جب ماں باپ ہی کہیں گے کہ تم مرد ہو اور وہ

تو عورت ہے۔ مرد ایک وقت میں چار شادیاں کر سکتا ہے۔ اسلام میں اجازت ہے۔ اور عورت کو ایک ہی نکاح میں مجبور ہو کر زندگی بسر کرنی ہے۔ چاہے وہ نہ بھی رہنا چاہے۔ اس کو اسلام نے اجازت نہیں دی۔

وہ یہ نہیں بتاتی کہ اسلام نے مرد کو چار شادیوں کی اجازت مردانگی اور عیاشی کے لیے نہیں دی۔ بلکہ ان کی صورتیں مقرر کی ہیں اور کی ہیں تو ان میں توازن کا حکم فرمایا ہے۔

یہ نہیں بتاتیں کہ تمہاری یہ سگی بہن ہے اور جس طرح تم کسی کی بہن کو دیکھتے ہو کل کوئی تمہاری بہن کو بھی دیکھے گا۔

اور جو والدین یہ سب بتاتے ہیں تو معاشرتی برائیاں آڑے آجاتی ہیں۔ سب سے پہلے غربت، بے انصافی، بد دیانتی اور سٹیٹس کا فرق نہایت نفسیاتی بنا رہا ہے آج کل کی نسل آگے نکلنے کا جنون، ضد انا اور خود غرضی، انٹرنیٹ، مذہب سے دوری نہایت اہم جز ہے۔ جب تک خوف خدا نہیں ہے تو یہ جانور خود کو انسان کیسے سمجھیں گے۔

کوئی اس حیوان کو یہ بتاتا کہ تم نے سامان لوٹ لیا تو تمہاری پوری نہ پڑی۔ عزت تو چھوڑ دیتے۔ مگر کہیں نہ کہیں نفس کی گندگی، حیوانیت کا جنون اور کہیں بچپن میں خود کا حاکمانہ رویہ اس عمل کی طرف لے گیا۔

حکومت کی طرف دیکھیں تو یہاں تو گلے شکوے ہی دور نہیں ہوتے۔ ایک طرف اپوزیشن دوسری طرف حکومت سوتنوں کی طرح لڑتی ہیں۔

یہ نہیں سوچتی یہ ملک ہمارا ہے۔ جسے قائد اعظم محمد علی جناحؒ نے اتنی قربانیوں کے بعد ہمیں وطن لے کر دیا ہے اس کی قدر کر لیں اس کی حفاظت کریں تقریروں سے ہٹ کر عمل بھی کر لیں۔

کاغذی کاروائیوں کے بجائے عمل بھی کریں مگر نہیں ----

دور کوئی بھی آئے ہم نے صرف لڑنا ہے یا کھانا ہے ----------اڑانا ہے۔

آپ کھاتے آپ اڑاتے اب آپ کی عوام کی عزت بھی اڑ رہی ہے۔

وہ ---------- ریاست مدینہ ماہر نفسیات کے مطابق جرائم پیشہ درندے ایسے ہوتے ہیں جن کو بچپن ہی سے ان کی حرکات و افعال پر نظر رکھنی چاہیے۔ کہ شاید انہوں نے بچپن ہی سے کسی چیز کی ضد کی ہے تو اس کو پورا کیا چاہے انہیں کسی حد تک جانا پڑے۔ یا کوئی عجیب عمل کیا تو ماں باپ نے غور نہیں کیا۔

لہٰذا پیدائش سے جب تک انسان واقعی انسان نہیں بن جاتا تو والدین کا کردار نہایت اہم ہوتا ہے۔ اس کے بعد معاشرہ حکومت اور ماحول میں آتے ہیں۔

ٹول ٹیکس کی ادائیگی کرنا اور وصول کرنے کا ان کو پتہ ہوتا ہے مگر صارف کی کال پر وقت

پر پہنچنا ان کا کام نہیں ہے۔
ریاست مدینہ میں انسان اتنا غیر محفوظ کیوں؟
اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش میں آپ کو تاریخ کے ایک واقعے کا ذکر کرنا چاہوں گی۔
سلطان التمش ایک بادشاہ تھا۔ اس کو حضرت خضرؑ سے ملنے کا بہت شوق تھا۔ ایک دن اس نے اپنے تمام وزراء درباری اور درویش حتی کہ ہر طبقہ فکر کو دربار میں بلایا اور اپنی خواہش کا اظہار کیا تو تمام درباریوں نے خاموشی اختیار کر لی۔ جب بادشاہ نے کہا کے تم میں سے کون وہ شخص ہے جو میری حضرت خضرؑ سے ملاقات کروائے؟ اس پر ایک غریب آدمی نے ہاتھ کھڑا کیا اور کہا بادشاہ سلامت میں کراؤں گا۔
اور اس پر تمام درباری خاموش ہو گئے اس نے کہا کے میں آپ کی ملاقات حضرت خضرؑ سے کراؤں گا مگر چونکہ میں ایک غریب آدمی ہوں تو نہر پر جا کر پانی میں کھڑے ہو کر مجھے عبادت کرنا ہوگی اس میں چھ ماہ کا عرصہ درکار ہے۔ اس دوران میرے بیوی، بچوں کی کفالت کا ذمہ لینا ہو گا اور بادشاہ رضامند ہو گیا اور اس کو چھے ماہ کا وقت دیا۔
چھے ماہ بعد اس کو بلایا گیا اور کام کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے جواب دیا کہ اس عرصے میں میں جو عبادت کر رہا تھا اس میں مجھ سے غلطی ہو گئی ہے۔ اس لیے مجھے چھے ماہ اور درکار ہوں گے۔
اور بادشاہ سے دوبارہ اجازت لی۔ اور بادشاہ نے دوبارہ اسکے بیوی بچوں کی کفالت کی۔ یوں چھے ماہ اور گزر گئے۔
تو چھے ماہ بعد اس کو دوبارہ بلایا گیا تو اس نے کہا بادشاہ سلامت بات دراصل یہ ہے کہ میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا کہ میں آپ کی حضرت خضرؑ سے ملاقات کراؤں گا۔ میں تو ایک غریب بندہ ہوں میری اتنی مجال کہاں ہے یہ تو نیک لوگوں کے اختیار میں ہوگا۔ میں ایک غریب آدمی ہوں میرے حالات خراب تھے تو میں نے جھوٹ بولا کہ اس عرصے تک میرے بیوی بچوں کی کفالت ہو جائے گی۔
اس پر بادشاہ کو شدید غصہ آیا۔
اور بادشاہ نے دربار میں ایک وزیر سے پوچھا کہ اس کو کیا سزا دینی چاہیے؟
اس پر ایک وزیر نے کہا بادشاہ اس کا سر تن سے جدا کر دینا چاہیے۔ دوسرے وزیر نے کہا۔ بادشاہ سلامت اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کتوں کے آگے ڈال دینا چاہیے، جس پر دربار میں ایک بوڑھے شخص نے کہا دونوں بار کے یہ صحیح کہہ رہا ہے۔
پھر بادشاہ نے اپنے دوست محمود سے مشورہ کیا۔ تو اس نے کہا۔ بادشاہ سلامت اسے معاف کر دینا چاہیے تو اسی بوڑھے نے اس پر بھی یہی کہا کہ یہ سچ کہہ رہا ہے
یہ سن کر بادشاہ حیران ہو گیا اور اس بوڑھے

آدمی سے کہنے لگا۔ ہر بار آپ ہر کسی کی رائے کو صحیح کہتے ہیں کیوں؟

تو اس پر اس نے جواز یہ پیش کیا کہ پہلا شخص جس نے آپ کو کہا کہ اس کا سر تن سے جدا کر دیا جائے اس کے آباؤ اجداد قصائی ہیں تو اسی لیے اس نے اس طرح کا مشورہ دیا دوسرے شخص نے جو رائے دی کہ اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں تو اس کے آباؤ اجداد بادشاہ کے دربار کے کتوں اور جانوروں کو نہلاتے ہیں تو اس نے اس طرح کا جواب دیا۔

اور محمود نے جو کہا کہ اس کو معاف کر دیا جائے تو محمود ایک سید گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے اس نے اس طرح کا جواب دیا۔

اسی لیے ہر کسی نے اپنے اپنے جواب سے اپنے آباؤ اجداد کا پتہ دیا۔

اس پر بادشاہ نے حیران ہو کر محمود سے کہا کہ تم نے مجھے آج تک نہیں بتایا کہ تم سید ہو اور بادشاہ اٹھ کھڑا ہوا کیوں کہ بادشاہ سیدوں کی نہایت عزت کرتا تھا۔

تو محمود نے جواب دیا بادشاہ کبھی اس کی نوبت پیش نہیں آئی اور کیونکہ آج اس بوڑھے نے میرا پردہ اٹھا دیا ہے تو میں بھی اس کے بارے میں ایک راز دے دوں کہ یہ بوڑھا جو باتیں کر رہا ہے یہ ہی اصل میں حضرت خواجہ خضرؑ ہیں اس بات پر بادشاہ نے چونک کر جونہی اس بوڑھے آدمی کو دیکھا تو وہ غائب ہو گیا۔

تو یوں ثابت ہوا ہر شخص اپنے گفتار سے اپنی قوم کا پتہ دیتی ہے۔

اس لیے یہ لمحہ فکریہ ہے کہ امت مسلمہ میں یہ یزید یا فرعون کیوں؟

امت مسلمہ وہ ہے جس نے انسانوں کی عزت کی۔ جس کے دین میں اللہ پاک نے عورتوں کی عزت سے پیش آنے کا حکم دیا۔

اس عزت کے لیے عورت کو ماں، بیوی، بہن، بیٹی کے رشتوں میں نوازا گیا تو پھر یہ رشتوں کی تذلیل کیوں؟

پھر یہ حیوانیت کیوں؟

آپؐ نے عورتوں کی عزت کی۔ انسانیت کا درس دیا۔ تو پھر یہ حیوانیت کیوں؟

لہٰذا باہر کے مسائل تو بجا ہیں ان پر حکومت معاشرے عوام سب کو کردار ادا کرنا ہوگا ہی ہماری آئندہ نسلوں کے لیے مگر خدارا اپنے گھروں پر سب سے زیادہ توجہ دیں۔ ان کی تربیت و ماحول پر توجہ دیں عزت کرنا سیکھیں اور عزت کروائیں۔

تاکہ پھر کوئی عابد کوئی شفقت کسی خاتون سے یہ دردناک واقعے نہ کریں۔

ان کو تختہ دار پہ سر عام لٹکا دیں تاکہ ایسے حیوان اور اس طرح کے کئی اور حیوان خبردار ہوں اور ہمارا معاشرہ ان برائیوں سے پاک ہو۔ (آمین)

☆☆☆☆☆

ابیاتِ نصیر

برصغیر پاک و ہند میں صوفیائے عظام اور اولیاء اللہ نے بذریعہ کردار و تبلیغ بے شمار گم گشتگان بادیہ کفر و ضلالت کو صراط مستقیم پر گامزن کیا۔ اسلام تلوار کے بجائے اولیاء اللہ کے کردار اور پیار سے پھیلا۔ صوفیا نے مخلوق خدا کو پیغام محبت سے آشنا کیا اور انھیں انسانیت کا درس دے کر اسلامی معاشرہ تشکیل دیا۔

مادری و علاقائی زبان میں ابلاغ ایک موثر ذریعہ ہے۔ برصغیر پاک و ہند کے صوفیا اور اولیاء اللہ نے عربی، فارسی اور اردو کے علاوہ اپنی علاقائی زبانوں کو مخلوق خدا کی رُشد و ہدایت کے لیے خاص طو پر اپنایا، پنجابی صوفیانہ کلام کو بے حد مقبولیت حاصل ہے۔ کیونکہ اس کلام میں ایسی چاشنی پائی جاتی ہے کہ جو کانوں میں رس گھولتی ہوئی اور دلوں میں ہلچل مچاتی ہوئی عام لوگوں کی زندگی میں بھی انقلاب برپا کرنے کی خوب صلاحیت رکھتی ہے۔ مثلاً سلطان العارفین حضرت سلطان باھوؒ کے پنجابی ابیات جو کہ اصلاح احوال کا زینہ اور باطنی صفائی کا خزینہ ہیں ان کے اکثر ابیات زبان زدِ عام ہیں۔ اسی طرح میاں محمد بخشؒ، بلھے شاہؒ، وارث شاہؒ، بابا فریدؒ اور شاہ حسینؒ جیسے صوفیا کا پنجابی کلام اب بھی لوگوں کے دلوں پر سحر طاری کیے ہوئے ہے۔

غوث زمانہ پیر سید مہر علی شاہؒ جن کا زمانہ معترف ہے اور اپنی مثال آپ ہیں۔ اسی گھرانہ کے چشم و چراغ سید نصیر الدینؒ جن کا تعارف محتاج بیان نہیں۔

نصیر الدین نصیر کثیر الجہات شخصیت کے مالک ہیں اور انھوں اپنی زندگی میں انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ فقید المثال خطیب ہونے کے ساتھ ساتھ بلند پایہ کے شاعر بھی ہیں جن کی شاعرانہ عظمت کا ڈنکا دیار غیر میں بھی بجتا ہے۔ نصیر الدین کو ہفت زباں شاعر ہونے اعزاز حاصل ہے۔ ان کا پنجابی کلام بعنوان ''پنجابی کلام در رنگِ ابیات حضرت سلطان باھوؒ'' جو کہ انسانیت کے درس و تبلیغ کا مخزن ہے۔ سلطان باھوؒ کے رنگ میں کہے گئے یہ ابیات بلحاظ تعداد اگرچہ قلیل ہیں لیکن ہو کی تڑپ سے معمور

ساجد اقبال

ہیں۔ ان ابیات میں مختلف موضوعات کو عنوانات کے تحت زیر بحث لایا گیا ہے۔
نصیر الدین کے پُرتاثیر لہجے میں ایسی مٹھاس ہے کہ سامعین پر ایک عجب کیف طاری ہو جاتا ہے۔ نصیر بے باکی کے ساتھ حقیقت کو بیان کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے وہ ریاکاری سے سخت نفرت اور اخلاص سے بے حد محبت کرتے ہیں ابیاتِ نصیر سماجی بد اعتقاد کو ترک کر کے عشق و مستی کا جام پلاتے ہیں۔ اپنے مخاطب کے لیے ایسے الفاظ کا چناؤ کرتے ہیں کہ جو اُن کے لیے عین موافق ہوتے ہیں۔ ان کی پُرخلوص محبت رنگ رنگ سے جھلکتی نظر آتی ہے کیونکہ صوفیا کا مشن ہی محبت اور خیر بانٹنا ہے۔
ابیات نصیر کے ابتدائی چند ابیات توحید و رسالت کے مضامین پر مبنی ہیں۔ رب کی رحمت اس کے غضب پر حاوی ہے وہ اپنے بندے کو وہی عطا فرماتا ہے جو بندے کے لیے مفید ہو۔ منشا خداوندی تو یہی ہے کہ بندے کو رحمتوں سے نوازا جائے۔ وہ کریم مطلق ہے اس کی رحمت تو بندے کی بخشش و مغفرت کے لیے مختلف بہانے تلاش کرتی ہے۔ اس دنیا میں آقا دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بغیر کوئی درجہ اکملیت پر فائز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے بغیر کوئی فقط اپنے اعمال حسنہ پر بھروسہ نہیں کر سکتا جب تک رب کا کرم شامل حال نہ ہو کوئی فلاح نہیں پا سکتا ایک بیت بعنوان 'رحمت کے فیصلے' کے حوالے سے دیکھیے:

رب دی مثل نہ کوئی دانا جو دیوے بے منگے ھو
ڈٹھل نصیر نہ دیون دیوے جس نوں جس رنگ رنگے ھو
جے پچھ ہووے عملاں تائیں کِتھن چنگے چنگلے ھو
جے اوہ آ جاوے فضلاں تے کج دیوے لکھ ننگے ھو

....

حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں جنیدؒ و بایزیدؒ جیسے باصفا جب حاضر ہوتے ہیں تو سانس تک آہستہ لیتے ہیں کیونکہ آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چوکھٹ پر حاضری ہونے کی تعظیم اللہ نے خود قرآن میں سکھائی ہے۔ اس لیے نصیر بھی عاجزی انکساری کا دامن تھامے ہوئے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ اقدس میں التجا کرتے ہیں۔ میں ایک بات پورے وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ اگر کوئی آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دل و جان سے پکارے تو حضور یقیناً کرم تو فرماتے ہیں اور سائل کی امید بر لاتے ہوئے اس کی آرزوئے دل پوری کرتے ہیں۔
ایک بیت بعنوان 'التجا بحضور سید الوریٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چند اشعار دیکھیے:

ہک دن میں پیا دل وچ روواں ہتھوں جرم خطائیں ھُو
آکھاں کملی والیا سائیاں عرضی نہ ٹھکرائیں ھُو
جد اعمال ترکڑی تلسن جھات کرم دی پائیں ھُو
عمل نکچے پینڈے لمبے ڈگدی نوں گل لائیں ھُو

....

بیت کے آخری اشعار دیکھیں جن میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کرم فرمائی نظر آتی ہے:

حضرتؐ بولے عاصی بندیا روگ نہ دل نوں لائیں ھو
ھلسن ہوتھ شفاعت میرے تھیسن رد بلائیں ھُو
میں جانڑاں مرا مالک جانڑیں اینویں نہ گھبرائیں ھُو
ہٹ کی خوف نصیر مینوں میرا جیوے سردار سائیں ھُو

....

امام عالی مقام حضرت امام حسینؓ کی بارگاہ میں ہدیہ عقیدت پیش کرتے انھیں اسلام کی سربلندی اور عظمت کا ذریعہ قرار دیا ہے بیت کا ایک ہی مصرع ملاحظہ ہو:

سینچیا جس اسلام دا بوٹا دے کے خون دا پاڑیں ھُو

....

دور حاضر میں دوستی کا معیار تبدیل ہو گیا ہے۔ آج کی اکثر دوستی کثرت زر کے گرد گھومتی نظر آتی ہے اخلاص سے تہی دامن دوستی کے حوالے سے بیت کا ایک مصرع دیکھیے:

جانی یار نصیر نہ ملدے نانی یار بتیرے ھُو

....

سچے دوست اور سچے یاروں کے وجود کو غنیمت سمجھا جائے انھی کے دم قدم سے دوستی کا وجود برقرار ہے۔ ایسے دوستوں کے دامن سے ہی بہاریں وابستہ ہوتی ہیں بیت بعنوان 'سچے یار' قارئین کو اپنے احباب سے ہمکلام کراتا ہوا، مسرتیں بکھرتا ہوا ان کی عظمت کو اُجاگر کر رہا ہے۔

جگ جگ جیون یار سچیرے ویکھاں سا چہرے ھُو
وسن گلیاں، کھلن بوہے، وی نہ مکن پھیرے ھو
رونق میلے، گلاں باتاں، درشن شام سویرے جیو
یاراں نال نصیر بہاراں یاراں باجھ ہنیرے ھو

....

اور قدر و منزلت کو بڑے احسن اور مدلل انداز میں بڑی مودت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ بیت کا آخری مصرع ملاحظہ ہو:

عبدالقادرؒ پیر مرا جیہڑا اتار دیوے ہتھ پھڑ کے ھُو

....

انسان کو اشرف المخلوقات کا شرف حاصل ہے۔ جب انسان حرص و ہوس کو اپنا شعار بنا لیتا ہے تو انسانیت کے دائرے سے نکل کر حیوانیت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ انسان کو درد دل کے واسطے پیدا کیا گیا جب درد دل ختم ہو جاتا ہے تو حرص کی بنا پر انسانیت بھی اپنا تشخص کھو دیتی ہے۔ ایک بیت بعنوان ''آنکھ کی حرص'' میں نصیر نے

لطیف نکتے کو بڑے کھلے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ کہ انسان کا پیٹ تو آخر کار بھر جاتا ہے لیکن اعضا انسانیت میں آنکھ پیٹ سے بڑھ کر حریص ہے۔ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہ سب کچھ اپنے دامن میں سمیٹنا چاہتی ہے۔

چھوڑ زمانہ پچھلا، تیوں گل سناواں اج دی ھُو
انسانی اکھ حرص دی ہانڈی ہر پاسے پئی بھجدی ھُو
چھوڑ ہوس نے پالے کن وچ گل نصیرا ایہہ سچ دی ھُو
بُھکھا ڈھڈ تے رج وی جاکے بُھکھی اکھ نہ رج دی ھُو

....

اگر صوفیا کی زندگیوں کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ صوفی ظاہر صفائی کے ساتھ ساتھ باطنی صفائی پر خصوصی توجہ دیتا ہے۔ وہ خود کو تزکیہ نفس جیسے مراحل سے گزار کر پورے اخلاص کے ساتھ عمل کرتا ہے۔ جیسے نماز کے بارے میں فرمایا گیا کہ یوں نماز پڑھو تم اللہ کو دیکھ رہے ہو اگر یہ نہ کر سکو تو دل میں یہ خیال ضرور رکھو کہ اللہ تمھیں دیکھ رہا ہے۔ صرف تسبیح پھیرنے سے بات نہیں بنتی جب تک دل میں کوئی ہلچل پیدا نہ ہو۔ ایک بیت بعنوان ''نماز حضوری'' کے حوالے سے دیکھیے:

کی واجب کی فرض ترے جے توں پریم نماز نہ نیتی ھُو
جنہاں دے دل وچ یار دے انہاں کدی قضا نہ کیتی ھُو
وضو ترے دا کی فیدا جد اندر لکھ پلیتی ھُو
دتے بھید نہ مستی دا جس بے پیمانے پیتی ھُو
جنہاں نصیر حضوری پائی نہیں محتاج مستی ھُو

....

مختصراً ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ اسرار و رموز سے معمور ابیاتِ نصیر جہاں تشنگانِ علم و معرفت کے لیے خزانہ اور راہ سلوک کے مسافروں کے لیے زینہ کی حیثیت رکھتے ہیں وہیں مجھ جیسے قارئین کی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لَو لگا کر ہمارے قلوب و اذہان کو منور کرتے ہوئے ہماری قلبی تسکین کا باعث بنتے ہیں۔ ابیاتِ نصیر کے آخر سے اگر ''ھُو'' ہٹا دیا جائے تو انہیں کلام میاں محمد بخشؒ کی طرز پر بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ جو کہ ابیات نصیر ہی کی خاصیت ہے۔ افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہم ایک ایسے ذی شعور انسان محروم ہو گئے جو اپنی جان پہ کھیل کر نصیر کہلایا۔ 13 فروری 2009 بروز جمعۃ المبارک کو قیامت صغریٰ برپا کر کے وہ اپنے چاہنے والوں کو ہمیشہ کے لیے داغ مفارقت دے گئے۔

بے قدراں نوں قدر نہ جانی کیتی خوب تسلی ھُو
دنیا دار پجاری زر دے کُتیاں دے گل ٹلی ھُو
تک تک اتھرو روون اکھیاں ویکھ حویلی کلی ھُو
کوچ نصیرا اساں جد کیتا پے جاسی تھر تھلی ھُو

☆☆☆☆☆

مری شراب میں پانی ملا دیا کس نے

مرے خدا!

ترے دیں دار راست باز نہیں

مری صدا!

مری آلودگی سے مملو ہے

مری دُعا!

مری بدکاریوں کی بدبُو ہے

مرے خدا!

ابھی سب تجّسیں تمام نہ کر

ہر ایک رات!

نیا چاند سر پہ ہوتا ہے

ہر ایک صبح!

نئی عید کا تقاضا ہے

چہار سمت!

ذبیحوں کے سوختہ تن ہیں

مرے حبیب!

مرے ضبط سے کلام نہ کر

مری نگاہ!

مری سرکشی پہ نالاں ہے

مرا غرور!

دلِ بے وقار کی دھج ہے

سرِ بلند!

تکبّر کے بار سے کج ہے

مری شراب میں پانی ملا دیا کس نے

بدن پہ!
برف کی صورت سفید چادر دے
دلوں پہ!
قُفل کی صورت کلید صادر کر
لبوں پہ!
حرف کی صورت نوید کا دُر رہو
مرے خدا نے مرا انتقام کیوں نہ لیا
مرے خُدا!
تری تیغیں ہلوں کے پھالے ہیں
مرے خُدا!
تری باتیں دلوں کے ہالے ہیں
مرے خُدا!
ابھی کچھ حجتیں تمام نہ کر
تجھے قسم ہے مرے قرمزی گناہوں کی
سُن اے زمین!
سُن اے آسماں! سُن اے دُنیا
مرے خُدا کو!
مرے خون کی ضرورت تھی؟
مرے خدا کو!
غرض ہدیہ ہائے باطل سے؟
شرابِ ناب میں پانی ملا دیا کس نے

خالد احمد

اے مرے دوستو بھلے لوگو

اے مرے دوستو بھلے لوگو
عیب سے پاک تو ہے بس اِک وہ
جو ہے ہم سب کا پالنے والا
ہر اندھیرا اُجالنے والا

کس لئے پھر یہ خبط عظمت کا
کس لئے دوسروں کے عیبوں کی
گنتیاں ہی سدا گنے جانا
کس لئے نیند میں جیئے جانا!

اے مرے دوستو بھلے لوگو
آؤ بیٹھو مکالمہ کرکے
ایک دوجے کی خوبیاں جانیں
جو کمی ہو کسی میں وہ مانیں

جس رعائت کے آپ طالب ہوں
دوسروں کو بھی وہ عطا کردیں
جس معافی کو اپنا حق سمجھیں
دائرہ اِس کا کچھ بڑا کردیں

نظر انداز کرنا چاہیں تو
گفتگو کے حصار خوشبو میں
کسی سائے کو راستہ نہ ملے
کوئی سچ مچ کا مسئلہ نہ ملے

مل کے جینا جو سیکھ لیں ہم تم
کوئی اُلجھاؤ راہ میں نہ رہے
کوئی بیگانگی کا سایا تک
دل میں اور دل کی چاہ میں نہ رہے

اے مرے دوستو بھلے لوگو

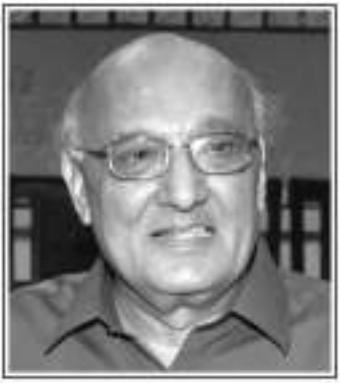

امجد اسلام امجد

کتنے موسم گزر گئے لیکن

کتنے موسم گزر گئے لیکن
اک وہ لمحہ گزر نہیں پایا
جس کے ماتھے پہ ہیں رقم اُس کے
وقتِ رخصت کے آخری جملے

''مجھ سے وعدہ کرو کہ تم مجھ کو
اب کبھی دیکھنے نہ آؤ گے
یاد میری اگر کبھی آئے
بس وہی شکل دھیان میں آئے
زندگی جس میں مسکراتی تھی
خواب ہی خواب تھے نگاہوں میں
روشنی آئنے سجاتی تھی
میں نہیں چاہتی کہ تم مجھ کو
اس طرح ٹوٹتا ہوا دیکھو
میرے چہرے میں، میری آنکھوں میں
وقت کو ڈوبتا ہوا دیکھو

دل نے روکا بہت مگر پھر بھی
اُس کے کہنے پہ میں چلا آیا
اپنے وعدے کی لاج رکھی اور
پھر اُسے دیکھ بھی نہیں پایا

وقت کتنا گزر گیا لیکن
اک وہ لمحہ گزر نہیں پایا
آج بھی ساتھ ساتھ چلتا ہے
اُسی وعدے کا ڈولتا سایا

کتنے موسم گزر گئے لیکن

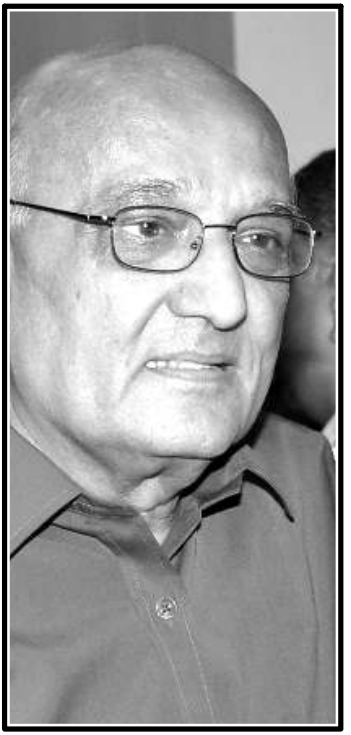

امجد اسلام امجد

محبت کے سفر میں

تری خاطر زیادہ سے زیادہ اور کیا ہو گا
ہمیں اعدا شکست و ریخت سے دوچار کر دیں گے
ہماری زندگی کو اور بھی دُشوار کر دیں گے
ستم کا دائرہ ہو گا کشادہ اور کیا ہو گا
بجا ہے مرحلے تیری تمنا میں کڑے ہوں گے
ترے خوابوں کا سودا سخت ٹھہرے یہ بھی ممکن ہے
کوئی تختہ ہمارا تخت ٹھہرے یہ بھی ممکن ہے
مگر ہر حال میں ہم استقامت سے کھڑے ہوں گے
ہمیں معلوم ہے تیرے جنوں کی انتہا کیا ہے
نہیں پروا کوئی ایسی جسارت کی سزا کیا ہے
یہی اک آس اکثر حوصلہ کھونے نہیں دیتی
ہمارا ذکر آئے گا وفا کے پاسداروں میں
گنے جائیں گے آخر ہم بھی تیرے جاں نثاروں میں
یہ خواہش معرکے سے دست کش ہونے نہیں دیتی
اسی اُمید پر غارت گروں سے جنگ جاری ہے
کہ جب میدان میں ہم جان کی بازی لگائیں گے
لہو سے سرخرو ہو کر تری نظروں میں آئیں گے
یہی مقصود ہے اپنا یہی منزل ہماری ہے
ہمارے نام سے منسوب پسپائی نہیں ہو گی
محبت کے سفر میں کوئی رُسوائی نہیں ہو گی

گلزار بخاری

بہت سے کام ہیں لیکن۔۔۔

ابھی تو آنکھ کی دہلیز پر
آنسو ستارہ وار رکھنے ہیں
ہجومِ ناشناساں سے
خطابِ خاص کرنا ہے
کِسی سے بات کہنا ہے
کِسی کی بات کا احساس کرنا ہے
مکاں اور لامکاں کے
دائروں میں سے گزرنا ہے
دھوئیں سے روشنی کی سمت جانا ہے
سمندر پر نظر کرنا ہے
اور صحرا کو اِن آنکھوں میں بھرنا ہے
کسی پاتال تک جانا ہے
اور واپس بھی آنا ہے
گھڑی یا دو گھڑی باغِ جہاں کی سیر کرنا ہے

بہت سے کام ہیں لیکن،
اچانک یاد آیا ہے
ابھی اِک نظم لِکھنا ہے

خاور اعجاز

لاحاصل

بچپن سے ہر کاغذ پر میں
سورج کھینچا کرتا تھا
ایک جھونپڑی
ایک سڑک
اک آسمان
اور کچھ ہریالی.....
عمر کا آخر آ پہنچا ہے
ساری عمر مسلسل میں نے
اس خاکے میں رنگ بھرتے ہیں
آسمان، سورج، ہریالی
جھونپڑا، رستہ اور پھلواری
سب کچھ ہے
پر اس منظر میں
تم بھی نہیں ہو
میں بھی نہیں ہوں۔

شاہنواز زیدی

اَن کہی کی خوشی

شبہ طراز

مہ و سال کی گردشوں سے پرے
زمین و زماں کی عنایت سے دور
مدھر اور سریلی سی دھیمی سی آواز!
پربت پہ جیسے ہوا چل رہی ہو،
دیے جل رہے ہوں،
پرندے اڑے جا رہے ہوں،
شبنم کے قطرے ، پتوں کے بستر
بھگو کے ہنسے جا رہے ہوں۔
ہاں ! وہ دھیرے سے ہنسنے کی آواز !
تو آؤ۔۔۔۔
محبت بھرے بادباں کھول دیں
سمندر کی لہریں
وعدوں کے سندیس ساحل پہ
دھرتی ہوئی جا رہی ہیں،
۔۔۔پربت پہ، جنگل میں، وادی میں
چشمے پہ ۔۔۔پتے
ہرے، نیلے، پیلے۔۔۔رنگین پتے
رنگین پتوں کی پازیبیں چھن چھن بجی ہیں
وہ دھیرے سے ہنسنے کی آواز
۔۔۔کیا ہے ۔۔؟
۔۔۔ہیلو۔۔؟ سنو۔۔۔؟؟
کیا تم نے مجھے کچھ کہا ہے ۔۔۔۔؟؟؟

بہت دیر تلک [نثری نظم]

طلعت شبیر

میں جب تم سے ملتا ہوں
تو بہت دیر تلک
تمھارے پہلو میں بیٹھا
پہلو بدلتا رہتا ہوں
تمھاری مدھر سُریلی آواز
اور تمھاری رفاقت کے پاگل پن
کے سحر میں رہتا ہوں
میں جب تم سے مل کے لوٹتا ہوں
تو مارگلہ کے دامن میں
لمبی تنہا سڑک پر
بہت دیر تلک
ایسا دھیرے دھیرے
ڈرائیو کرتا ہوں
جیسے مجھے گھر نہیں پہنچنا
اور پھر بہت دیر تلک
مجھے لمحوں کی جدائی کے رنج
بے بسی کی مسافتوں کے لشکر
اور روایتوں کی غلام گردشیں
گھیرے رکھتے ہیں
بہت دیر تلک

عروض

مری محبت کی نظم پڑھ کے
خلا میں نظریں جمائے تم نے
کمال حیرت سے
مجھ سے یونہی سوال پوچھا
عروض کیا ہیں؟
یہ فاعلاتن مفاعلاتن کی بحر کیا ہے
یہ وزن کیا ہے؟ مجھے بتاؤ!
کسی بھی میٹر میں شعر کہنا مجھے سکھاؤ!
مری طبعیت ہے شاعرانہ
مجھے بھی کہنے ہیں شعر اچھے
مجھے سکھا دو، کچھ ایسا فعلن.. مفاعلاتن
جو اک تسلسل میں، لہر میں ہو
جو بس محبت کی بحر میں ہو

تو یاد ہے ناں... کہ سامنے کی مثال
دے کر ہی
میں نے تم کو سکھا دیا تھا!
تمہارے عارض عروض سے ہیں.....
یہ میں نے کھل کر بتا دیا تھا.
یہ میں نے تم کو مثال دی تھی،
کہ تیرے بالائی لب کا جو حاشیہ ہے
سمجھو یہ قافیہ ہے
ردیف جیسے، یہ زیریں لب ہے
ردیف جوڑو گی قافیے سے
تو ایک مصرع بنے گا جاناں.

اس ایک لمحے میں مسکرا کر جو تم نے دیکھا
تھا میری جانب
وہ مسکراہٹ تھی بحر جاناں
تو یاد ہوگا
اُس ایک ہلکی سی مسکراہٹ پہ میں نے ہنس کر
گرہ لگائی
تو شعر ہونے میں پل لگا تھا
کہ جس کی تقطیع میں زمانے لگیں گے شاید
تو شوخ لڑکی! تمہیں محبت کی نظم کہنا تو
آ گیا ہے
مگر کسی کو بتانہ دینا
کہ تم نے کس سے عروض سیکھا

عاطف جاوید عاطف

دوٹوک

[نثری نظم]

آخر کا

دروازہ کھلتا ہے

دستک کا شور

وقت کے بیکراں لمحات کی رو میں

نجانے کہاں غائب، گم ہو جاتا ہے

وقت کی شاہراہ پر

چلتے چلتے

سمندر کے پاس

مٹی کے کھلونوں کا رقص دیکھتے ہوئے

خوابوں کی رت میں نمی کا کردار

لازوال ہے

ہم سچ پہ

مزید کتنے قصیدے لکھیں

کہ جھوٹ ننگا ہو

اور لفظوں کو معنی کی فضا میسر آئے

ہمیں مفہوم کی بے ریا لطافت کی جستجو میں

احساس کے نرم بستر پر

نیند کی گولی نہیں چاہیے

ہم رات بھر جاگ سکتے ہیں

روشنی کا تاوان دیے بغیر

لیکن پھولوں سے بغاوت کا الزام

اور اندھیروں سے کنارہ کشی اختیار نہیں

کر سکتے

امجد بابر

لفظوں کی حکومت

[نثری نظم]

بھوکے شخص کو روٹی چاہیے
چاہے سلاد کے بغیر ہو
پیٹ بھرنے کے لیے
یہاں سب چلتا ہے
جیسے سڑکوں پہ بے ہنگم ٹریفک کا شور
رات کے بستر میں چھپ کر
ستاروں سے باتیں کرتا ہے

آنکھوں میں زندہ رہنے کے لیے
تصویر بنانی پڑتی ہے
جنگل کا قانون
کسی شریف لڑکی کو اجازت نہیں دیتا
کہ وہ برگد کے درخت سے لپٹ کر
حاملہ ہو جائے ویسے بھی
خزاں کے موسم میں شکایت کرنا منع ہے

ہمیں دیواروں کی کمی نہیں
اشتہاروں میں ترمیم کی ضرورت ہے
تاکہ لفظوں کی حوصلہ شکنی نہ ہو

ہمیں افسوس کی ڈھلوان سے بچ کر
اب نئے عہد کا دستور مرتب کرنا ہے
جہاں روشنی، ہوا اور پانی کی حکومت ہو
آگ کو تحفظ دینے کی روایت کا اجرا پرانا ہے

راستے کے سگنل

[نثری نظم]

اگر
خطرے کی بو
دھندلکے میں
اجنبی منظر کی صورت دکھائی دینے لگے

خوف کی سیاہ چھتری
ہاتھ کے مدار میں
بلاوجہ گھومنے لگے

بے بسی
پتھر پہ لکیر کی صورت
چہرے کو
خلا کی پراسراریت سکھائے

بادلوں سے
بارش سوکھ جائے
جسم کی زرخیزی کا ہنر
تاریکی کے سائے میں
روٹھ جائے

اپنے آپ کو کوئی کیا سمجھائے
کہاں تک جائے
کشف کے بوجھ کو اُٹھائے
کچھ بھی نظر نہ آئے

امجد بابر

ہوس

[نثری نظم]

تم نے دن خیرات میں دے دیئے
اور رات کی قیمت لگائی
تم نے پھولوں سے بھری،
روشنیوں کے درمیان
گھوڑوں کے دوڑنے کے اسباب رکھے،
تم نے آنکھوں کے کونوں پر
درد کی جھالریں لٹکائیں
پھر کیسے سورج کی چادر نے تمہاری،
زمین کی چھاتیوں کو ڈھانپ لیا
ایک لڑکھڑاتا ہوا ڈھانچہ
ہڈیوں پر کہانی لکھتا رہا
زندگی قطرہ قطرہ زمین میں جذب ہوتی رہی
اُلو کی آنکھ والے شکاری نے،
گھنے جنگل کی غلاظت کو چکھا تھا
گِدھوں نے اپنی خوراک حاصل کی
اور اڑ گئے،
تم دو پاؤں والے جانور بن گئے،
تمہاری سوچ کا چوپایہ
پیٹ کے بل رینگنے لگا، گویا ہشت پایہ ہو
اپنی اصلیت کو تم نے
دھڑکنی بے سینے میں چھپالیا،
دیوار کے پار کئی طرح کے بیج اُگے
جھاڑ جھنکار اور بچھو بوٹی
تم تاریک گڑھوں سے روشنی تلاش کرنے گئے
روشنی کسی غار میں قید ہے،
چلو ہم اپنی مٹھیاں بھر لیں
اور ہواؤں کے بازوؤں پر روشنی روانہ کریں
سوگ میں ڈوبی آنکھوں کو
بادل کی ضرورت تھی،
بارش، بجلی اور روشنی
زندگی کی حسرتوں کے درمیاں
دن کو خیرات کرنے والے
تمہاری بھوک کیسے مٹے گی
تمہاری ہوس کبھی کم نہیں ہوتی،

آسناتھ کنول

خدوخال

[نثری نظم]

ہم گمشدہ لوگ
کہ جن کی نشانیاں
وقت کی کتاب میں لکھی پڑی ہیں
یعنی

ہونٹ
مسکراہٹوں کے شہر سے نکالے ہوئے

آنکھیں
خواب نگر کی جھلائی ہوئیں

دل
ویرانیوں کی سفید بارشوں میں ڈوبا ہوا

ہاتھ
مقدر کی لکیروں کے ٹھکرائے ہوئے

پاؤں
کڑی مسافتوں سے بھاگے ہوئے

زبان
سچائیوں سے ڈری ہوئی

چہرہ
کئی چہروں میں چھپا ہوا

احساس
بے حسی کے گرد سے اٹا ہوا

اور ہم
اداس رتوں کے گائے ہوئے
مگر افسوس
اتنی کھری علامتوں کے بعد بھی
ہم کسی کی دسترس میں نہیں۔

اداسی کے سکے

[نثری نظم]

ہم وقت کے ہونٹوں سے
چرایا ہوا وہ گیت ہیں
جسے گایا نہ جا سکا

اور اب ہم
شہر کے در و دیوار پر
لکھا ہوا وہ نوحہ ہیں
جسے پڑھتے ہی شہر میں
اداسی کے سکے پھیل جاتے ہیں

منیر احمد فردوس

نثری نظم

زندگی رشتوں کے گورکھ دھندے میں الجھ کر
رہ گئی ہے
آنکھیں جیسے پہچان ہی کھو بیٹھی ہیں
سو ہم رشتوں کو مصلحتوں کا ملبوس اوڑھا کر
اپنی مرضی کا نام دے دیتے ہیں

کبھی شیریں لہجوں میں چھپی
بیزاری کی لپٹیں
روح کو جھلساتی ہیں
اور کہیں محبت گریز کی چادر اوڑھ کر
مصروفیت کے سفر پر جا نکلتی ہے
دل کے بہت قریں دھکنے والے وقت پڑنے پر
صدیوں کی دوری پر ملتے ہیں
خود اذیتی روز رشتوں کے بازار میں تعلق کو
مصلحت کی بھینٹ چڑھتے دیکھتی ہے

جانے گریز کے خنجر سے
کس کس دل کا خون ہوا ہے
سننے میں آیا ہے کہ جذبوں کی منڈی میں
مہر و خلوص سے گندھی دعاؤں کا بھاؤ
بہت گر گیا ہے
مفادات کی قیمت آسمان کو چھونے لگی ہے
سو اس نے بھی
جذبوں کی تمام ترانویسمنٹ
اپنے مفادات پر کر دی ہے
یہ سوچ کر کہ دعا دینے والے لب
بے غرض ہوتے ہیں
اور دعاؤں کے پھول سدا بہار

☆☆☆☆☆

نائیلہ راٹھور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خالد ، خلا خلا وہی سودائے آگہی
صحرا نورد راہیٔ افلاک ہو گئے

نثری نظم

امین کنجاہی

یہ جاننے میں
مجھے کتنے سال لگے
کہ میرے اندر تو ہے
شام ہوتے ہی
چاند کا روشن ہو جانا
رات ہوتے ہی
رات کی رانی کا آجانا
ایک ایسا لمحہ ہوتا ہے
جس کا میری زمیں سے
کوئی تعلق نہیں ہوتا
اس آسمانی پل نے
مجھے اب چھو لیا ہے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

آنکھ کب جھپکے گی، بکھرے گی یہ زنجیر کہاں
اے مرے خواب رواں ! ہے تری تعبیر کہاں

الٹرا ماڈرن زمانے کا نوحہ

فیس بک پر لگائے ہوئے زخم
تمھاری ایک ٹویٹ سے نہیں بھر سکتے،
تم نے جو کچھ واٹس ایپ کیا ہے
یہ سب خبریں ہیں اور یقین کرو،
محبت خبر نہیں ہوتی
تم مجھے سم بدل بدل کر میسج کرتی ہو
میں موسم بدل بدل کر میسج پڑھتا ہوں
موسم بدلنے کا وقفہ ہی مجھے ہجر لگتا ہے
میں تمھارے کسی میسج کو ڈیلیٹ نہیں کرتا
مگر میموری فل ہونے پر جو میسج بہت طویل ہو
اُسے ڈیلیٹ کر دیتا ہوں
کہ طوالت میں سچائی کم ہوتی ہے
اور میں صرف سچائی پسند کرتا ہوں
زندگی میں سچائی، میسج میں سچائی، محبت میں سچائی

سنو، فیس بک پر لگائے زخم
تمھاری ایک ٹویٹ سے نہیں بھر سکتے
فرصت ملے تو اس بار مشکبار کافی پیتے ہوئے
مجھے ویڈیو کال کرنا، اور دیکھ لینا،
فیس بک پر لگائے ہوئے زخم
جسموں کو کیسے نڈھال کرتے ہیں
اسٹار آئی لو یو، ہیش ملانے پر،

نڈھال جسم
ایک بار سکرین پر روشن ہوتے ہیں
اور پھر موبائل کی اتھاہ گہرائیوں میں دفن
ہو جاتے ہیں

اعجاز رضوی

خطوط

آصف ثاقب

محترم بیاض نگار عمران منظور سلامت رہیں!

السلام علیکم!

دل کو بڑھاوے ملے۔ اب کے بیاض جلدی آ گیا۔ مطالعے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ ادھر بیٹھو ادھر پڑھ لو۔ خدا آپ کو خوش رکھے آپ ہر مہینے خالد احمد کے کلام سے آنکھیں روشن کرتے ہیں۔ خالد احمد کی معجز نگاری کا لفظ لفظ گواہ ہے۔ ان کی لفظیت کی یگانگی مقتدر و معتبر ہے۔ اللہ تعالی نے خالد احمد کو شعری انفرادیت کا جو تمول عطا کیا تھا وہ نہ پہلے سنا نہ اب دیکھا۔ یا مظہر العجائب!! شعریات کے کیا کیا کارخانے میرے ممدوح کی دسترس میں ہیں۔ ملاحظہ ہو:

کھل گئیں احساس میں افکار کی گہرائیاں
مشتعل جذبات کے خودسر سمندر سو گئے
نیم خوابیدہ زمیں سورج کی جانب پھر گئی
ایک کروٹ میں ستاروں کے مقدر سو گئے

نوحہ کناں ہواؤ شعلہ بر جاں فضاؤ
دیکھو وہ جا رہا ہے جی بھر کے اُس کو رولو
دنیا فقط گماں ہے ، سب کچھ درونِ جاں ہے
جاگو ضرور خالد ، آنکھیں مگر نہ کھولو

امیجری مشتعل جذبات ''خودسر سمندر'' نیم خوابیدہ، نوحہ کناں ہواؤ درونِ جاں (طرح طرح کے دیگر متعلقات) تصوراتی جدّتوں اور شاعرانہ شدّتوں سے آب و رنگ ہو کر دل میں اترتی ہے۔ خالد احمد کو اللہ تعالیٰ نے احساسات کا دیوتا بنا کے ہمارے درمیان اتارا جب اس نے رنگ جما لیا پھر اسے واپس بلا لیا۔ بہت یاد آتا ہے۔

'بیاض' کا رنگا رنگ تحریری تماشے برحق۔ بہت خوب، سب کچھ آراستہ پیراستہ عقیدت نگاری میں 'بیاض' دست و قلم ہے۔ حمد و نعت و سلام کے پیرائے اسے رب العزت نے ودیعت کیے ہیں۔ اس باب میں سب عقیدت نگار اپنی سی کر دیکھتے ہیں۔ اور دل و جاں سے حاضرِ خدمت ہیں۔ حفیظ تائب (مرحوم) کی روایات ماشاءاللہ قائم و دائم ہے۔ اس سے ریاض حسین چودھری بھی یاد آ رہے ہیں۔ محترم شوکت علی شاہ بیاض کی رونق ہیں۔ ان کی تحریر کی گدگدی از حد شیریں ہے۔ وہ فرہاد کی طرح تیشہ بدست ہیں پتھر توڑتے ہیں لفظوں کی بیٹھی نہریں بہا دیتے ہیں۔ یہ بھی ایک انوکھا اچھوتا اسلوب ہے۔ ملی نغمے کی روایت بھی آپ نے اچھی ڈالی ہے۔ منظور ثاقب کی وطن سے ایسی محبت مثالی ہے۔ پاکستان پاکستان ہے۔ ہم سب پاکستانی اپنے خدا کا شکر ادا کرتے ہیں اس سے ہمیں قائداعظم کی رہنمائی میں کامیاب و کامران کیا۔ ہم آزاد فضا میں سانس لے رہے ہیں۔

خدا ہمیں قیادت کے بحران سے نکالے گا۔ لعن طعن کی سیاست سے نجات دے گا۔ ان شاءاللہ حبیب الرحمٰن نے ''تم لوٹ کے آجاتیں'' نے تڑپا دیا۔ میرا بھی یہی مسئلہ ہے اب تو یادیں ہی یادیں ہیں۔ لوٹ کے نہ آنے والی کی اخلاص بندیاں، دردمندیاں اور ہمدردیاں اب کہاں.....

خیر اندیش

'بیاض' کے اراکین ادارت کو سلام جن کی توجہ اور محنت سے بیاض بلا تعویق و تعطیل شائع بھی ہو رہا ہے اور پل بھی رہا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کی طرح ادیب و ادب پروری خالد احمد کا بھی مشن رہا ہے اور ادارت اسے جاری رکھے ہوئے ہے اور نئے آنے والے کے استقبال کے لیے تیار۔ خطوط کے حصے میں یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ کچھ قارئین گزشتہ شمارے میں چھپنے والی غزلوں کے جو سب نے پڑھ رکھی ہوتی ہیں مابعد کے شمارے میں منتخب اشعار کے تحت نقل کر دیتے ہیں اور اپنی پسند کے اشعار سب کی پسند ہاور کرتے اور کرواتے ہیں۔ مابعد کے شمارے میں ہر وہ شاعر جس کا کوئی شعر یا اشعار منتخب کیے جاتے ہیں۔ انتخاب کنندہ کا شکریہ ادا کرتا ہے اور انتخاب کنندہ کے اشعار بھی اپنے خط میں درج کر دیتا ہے۔ جانبین کی پبلسٹی ہوتی رہتی ہے۔ من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو۔ کا رواج ختم نہیں ہوا نہ ہوگا۔

خطوط کا وہ حصہ زیادہ مفید اور جاندار لگتا ہے جس میں شریک افراد بجائے ایک دوسرے کے قصیدے لکھنے کے کسی نہ کسی غلطی پر گرفت کرتے ہیں۔ اس سے لکھنوں کے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ بعض اعتراضات درست ہوتے ہیں اور بعض جوابات درست۔ جوابات میں درشتی بھی درستی کے ساتھ شامل ہو جاتی ہے کہ شاعر بالطبع نازک مخلوق ہوتے ہیں۔ عروض اور علم القافیہ سے آگاہی حضرت رسالہ تجھیں ہر شاعر کے لیے سودمند ہے۔ قواعد کی پابندی شعر میں حسن پیدا کرتی ہے۔ غالب نے تو قواعد کی پابندی کی اس حد تک لازمی قرار دے ڈالا تھا کہ تفتہ کو اس کی غزل پر سرزنش کرتے ہوئے لکھا:

''حضرت اس غزل میں پروانہ و پیمانہ و بتخانہ تین قافیے اصلی ہیں، دیوانہ چونکہ علم قرار پا کر ایک لغت جداگانہ مشخص ہو گیا ہے اس کو بھی قافیہ اصلی سمجھ لیجیے۔ باقی غلامانہ و مستانہ و مردانہ و ترکانہ و دلیرانہ و شکرانہ سب ناجائز و نامستحسن۔ ایطا اور ایطا بھی قبیح۔''

بہر حال آج کل شاعر حضرات ان قواعد کو قبیح سمجھتے ہیں۔ گرداب، خوناب بھی علم قرار پا کر آب کے ہم قافیہ ہو گئے ہیں تو قافیہ اصلی شمار ہوں گے۔ ایک لفظ دو مختلف معنوں میں آئے تو ان کا ہم قافیہ ہونا بھی جائز ہے اور مستحسن۔

یکے شاہدے در سمرقند بود
کہ شفتی بجائے سمرقند بود
(سعدی)

پہلے مصرعے میں سمرقند شہر کا نام اور دوسرے میں سمر کہانی اور قند کھانڈ۔

غالب بخن گرچہ گشت بھسر نیست
از نشۂ ہوش ہیچ اندر سر نیست
(غالب)

غالب غالب کا ورد اسم اعظم جان کر ہر شاعر، ناقد اور محقق کر رہا ہے تا ہم فیض سے محروم۔

آصف ثاقب کے خطوط میں بعض الفاظ کمپوزنگ کی غلطیوں کا شکار نظر آتے ہیں اور پروف ریڈر کی غفلت کا بھی، اس کی وجہ آصف ثاقب کی بدخطی بھی ہو سکتی ہے سارا قصور کمپوزر اور پروف ریڈر کا ٹھہرانا جلد بازی ہوگی۔ آصف ثاقب میری طرح اس دور میں پرائمری کے طالبعلم تھے جب تختی استعمال ہوتی تھی اور روزانہ کچھ وقت خوشخطی کے باہمی مقابلے کے لیے بچوں کو دیا جاتا تھا۔ شاباش بہت بڑا انعام تھا۔

اسی کی دہائی میں مذہبی جوش اور دینی خروش پورے جوبن پر پہنچ ہوا تھا۔ وہ مسلمان جو کسی نہ کسی لحاظ سے مرد مومن مرد حق کی نظر یا خبر میں کوئی نہ کوئی مقام رکھتے تھے اور ان کے نزدیک مرد مومن مرد حق طارم اعلیٰ پر فائز، جب بھی کوئی ٹی وی یا مائیک و مرد مومن مرد حق سامنے آ جاتا یا اور میکرو تکنے لگتا اور اس کا جوش و خروش دیکھ کر تحت الشعور میں پڑا خوابیدہ مصرع (شاید داغ کا)

اف تری کافر جوانی جوش پہ آئی ہوئی

فوراً ازیں جانب نا کردہ ترمیم و تحریف کے باوصف خود بخود ترمیم یافتہ حالت میں شعور کی سطح پر بیدار و نمودار ہو جاتا:

جوش پہ کافر مسلمانی ہے اف آئی ہوئی

مسلمانی کی یہ شان دیکھ کر بھی جس کسی نے واہ واہ نہیں کی اپنی مسلمانی کو مشتبہ و مشکوک ٹھہرایا کوڑے کھائے و نیا و دیا وی اور مرد با یہ عروج مسلمانی کے اسی عالم میں تعلیم کے کرتا دھرتاؤں کو خیال آیا کہ جس رسم الخط میں بچوں کی درسی کتابیں پرنٹ کی جاتی ہیں اسے بھی مسلمان کیا

جائے اور عربی رسم الخط اختیار کیا جائے تا کہ خدا اور ناخدا دونوں خوش ہو جائیں اور بچے بڑے ثواب دارین میں حصہ پائیں۔ جس طرح مال حرام تھوڑا تھوڑا کر کے نیچے سے اوپر پہنچ جاتا ہے، ثواب بھی تھوڑا تھوڑا کر کے نیچے سے اوپر پہنچ ہی جاتا ہے۔ اعمالناموں میں ڈیبٹ کریڈٹ برابر ہو جاتے ہیں اور دعاے مغفرت کی قبولیت کا مرحلہ آسان۔ بچوں کو ثواب میں سے ان کا حصہ ضرور ملا ہوگا لیکن خیر میں شر کا پہلو یہ نکل آیا کہ بچے بدخطا ہو گئے۔ کل کے یہ بچے آج جوان ہیں۔ لیکن میں اور آصف ثاقب تو ان ایام میں بھی جوانی کی سرحد چند سال پہلے ہی پار کر چکے تھے اپنی بدخطی کی وجہ، وجود یا وجوہات سے وہی آگاہ ہوں گے یہ ان کا نجی معاملہ ہے کرید ٹھیک نہیں۔

محمد ارشاد

نسیم سحر

۱۰/ اکتوبر ۲۰۲۰ء

برادرم عمران منظور جی۔ سلام مسنون۔ اکتوبر کا شمارہ بہت دن ہوئے پڑھ لیا تھا مگر اس پر کچھ تبصرہ کرتے کرتے اتنی دیر ہو گئی، خدا کرے یہ عریضہ آپ کو بروقت مل سکے۔

کچھ کہنے سے پہلے مرحوم خالد احمد کے چند اشعار جو اس شمارے میں قطعۂ کمر کے طور پر نظر نواز ہوئے، اور جن کی عمدگی میں کوئی شک نہیں۔

گل ہوں، بکھر نہ جاؤں، پلی ہوں، گزر نہ جاؤں
تکمیل کر لو اپنی، آغوش میں سمو لو

دیکھنا یہ ہے کہ ہم کیوں سر کہسار آئے
قد بڑھانے کو اگر آئے ہیں تو بیکار آئے
کسی تمثیل نے تکمیل نہ پائی، لیکن
سوا لنگ فنکار کا بھر کر کئی فنکار آئے

جناب سلیمان عبداللہ ڈار کا مضمون دانشمندانہ اور عارفانہ نثر کا خوبصورت امتزاج ہے اور اسے جتنی بار پڑھا آنکھوں کے ساتھ دل کے دریچے بھی وا ہو گئے، اللہ تعالیٰ ہمیں ان باتوں پر غور کرنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

اس شمارے کے کچھ عمدہ، حمدیہ و نعتیہ اشعار لکھ رہا ہوں:

میں نے حسنؔ بس اتنا کہا رب ذو الجلال
طے معرفت کا زینہ ہوا ایک آن میں
(حسن عسکری کاظمی)

اللہ اللہ کمال کن فیکون
اللہ اللہ خلقتیں تیری
(محمد انیس انصاری)

سانس کے آخری کنارے تک
سلسلہ وار حمد کہنی ہے
(سرور حسین نقشبندی)

فقط وہ سیرت کے نور سے دور ہوں گی عاقبت
فلاح کے فلسفوں کی جو خام کاریاں ہیں
(جلیل عالی)

یہ میری آنکھ کھلے آپ کے زمانے میں
میں سو کے اٹھوں تو ناممکنات سا کچھ ہو
(کبیر اطہر)

آپ آئے مدینے میں تو کچھ بچیاں دف پر
پڑھنے لگیں نغمات شہنشاہ رسولاں
(عقیل رحمانی)

عاشق بنے ہیں آپؐ کے، لیکن بوقتِ صبح
اٹھنا نماز کے لیے ہم پر گراں ہوا
(عطاالعزیز)

اور اب غزلوں کے کچھ چنیدہ اشعار:

جو ڈوبے تھے مرے ساتھی بھنور میں
انہیں اب تک کنارے ڈھونڈتے ہیں
(آصف ثاقب)

اس کا مقام و مرتبہ گو جانتا نہیں
ہر بوالہوس کو دعویٰ سودائے عشق ہے
(جمیل یوسف)

کشتیاں تو نے جو کاغذ کی بنائی تھیں حسنؔ
آج ان کے لیے دریا بھی بنا کاغذ پر
(حسن عباس رضا)

دھمالیں ڈالنے کو جی کہاں تھا
میں گھنگھرو باندھ رقصایا گیا ہوں
(سید مقبول حسین)

ذرا سے بیج میں بھی حوصلہ اتنا نکل آیا
زمیں تھی سخت، پھر بھی خاک سے پودا نکل آیا
(گلزار بخاری)

دوستی والہانہ کرتے ہیں
دشمنی وحشیانہ ہوتی ہے
(باقی احمد پوری)

کتابِ زیست کھلی رہ گئی شبِ ہجرت
ہوائے نیم شبی میں ورق ورق ہوئے ہم
(خاور اعجاز)

غلط، غلط، میں نئے عشق میں نہیں مصروف
میں اس کو پچھلے سبق کا اعادہ جانتا ہوں
(ریاض رومانی)

دکھ کے جنگل میں چل دیا تنہا
میں ترا انتظار کیوں کرتا
(طلعت شبیر)

جدیدیت کو بھی درکار ہے تڑکا روایت کا
نہ روکو حضرتِ غالبؔ کو ذکرِ میرؔ کرنے سے
(یعقوب پرواز)

جواز کیا ہے میکدے کا رخ کروں
نشہ ترے لبوں کے رس میں ہے ابھی
(آفتاب خان)

میں اس ادائے دل کم سخن کو کیا سمجھوں
جو منحرف بھی نہیں انحراف کرتے ہوئے
(علی حسین عابدی)

دن گزاریں گے رزق چنتے ہوئے
بزمِ یاراں میں شب گزاریں گے
(وسیم عباس)

تمہاری آنکھوں کا پوچھتے ہیں یہ سب ستارہ شناس مجھ سے
بتا بتا کر میں تھک گیا ہوں، مثال دی تھی، مثال دی تھی
(عاطف جاوید عاطف)

ڈور رشتوں کی ٹوٹ جائے گی
دونوں جانب کھچاؤ بڑھنے سے
(ارشد محمود ارشد)

مرا سکوت حقیقت سنانے آئے گا
مرا کلام یہاں کچھ دنوں کا ہے سائیں
(اسحاق وردگ)

افسانے، مضامین اور دیگر نثری تحریریں کچھ بہت اچھی لگیں اور ان پر بھی کچھ نہ کچھ کہنا بنتا ہے، مگر اب اِس خط کو مزید طول نہیں دینا چاہتا، اس لیے ان پر کوئی تبصرہ ملتوی کرتا ہوں۔ اللہ حافظ

رشید آفرین

محترمی و مکرمی جناب نعمان منظور صاحب!

سلام مسنون!

نہایت خوبصورت ٹائیٹل، اعلیٰ کوالٹی کاغذ پر اعلیٰ ترین مضامین نظم و نثر کے ساتھ ماہنامہ بیاض، لاہور کا ماہ اکتوبر 2020 کا شمارہ ملا۔ میری غزل شاملِ اشاعت فرمانے پر آپ کا شکر گزار ہوں۔ اللہ کریم آپ دونوں برادران اور آپ کے رفقائے کار حضرات کو صحت اور تندرستی عطا فرمائے تاکہ آپ لوگ اردو زبان و ادب کی اسی طرح آبیاری فرماتے رہیں آمین ثم آمین

حالانکہ میری چند تخلیقات جن میں شاہین اقبالؒ (دعائیہ) بسلام بہ حضور سرورِ کائنات، ایک نعت ''در فعنا لک ذکرک' غزل ''چاک پیہم تھما رہا ہوں'' نظم ''میرا شہر سیالکوٹ'' بیاض کے دفتر میں موجود ہیں۔ کسی دوسرے جریدے کو نہ بھیجنے کے اصول کا پابند ہوں، مجھے امید ہے کہ یہ بھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں 'بیاض' میں جگہ پالیں گی۔ آئندہ شمارے کے لیے بیاض کے باب ''یادِ رفتگاں'' کے لیے ایک نظم بہ عنوان 'بیادِ ناصر زیدی' اور ایک غزل ''بڑا احساس ہوا ہے مردہ جذبوں کے سب دھارے پتھر'' دونوں ارسالِ خدمت ہیں شاید کسی قابل ہوں۔

امید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔

خدا حافظ

سیدہ آمنہ ریاض

محترم عمران منظور!

السلام علیکم!

امید کرتی ہوں کہ آپ بخیریت ہوں گے "بیاض" کی پوری ٹیم مبارکباد کی حقدار ہے کہ آپ نے علم وادب سے محبت کرنے والوں کو ایک مستند، معیاری اور ٹاپ کلاس پلیٹ فارم مہیا کیا ہوا ہے۔ جیسے ہی "بیاض" کا اکتوبر کا رسالہ ہاتھوں میں آیا، تو سب سے پہلے اس کے دل نشین ٹائٹل نے دل موہ لیا۔ اس کے بعد "بشریٰ رحمٰن" کی "گپ" نے شام کی چائے کے ساتھ بہت مزہ دیا"۔ حمزہ ہاشمی سوز" اور "فرح شاہد" کی نظم اور غزل پڑھ کر دل باغ باغ ہوا۔ محترمہ "سلمیٰ اعوان" نے "طارق عزیز کے نام کا میوزیم بنانے کی ضرورت" لکھ کر گویا دل کی بات کہہ دی۔ محترم "صغیر احمد صغیر" کی شاندار غزلیں پڑھ کر بے اختیار داد دینے کو دل چاہا"۔ شفیق احمد خان" نے "محترم محمد سلیم طاہر" کو "مرصع راز" کی صورت میں زبردست خراجِ تحسین پیش کیا۔

میں ذاتی طور پر "دردانہ نوشین خان" کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی کہ انھوں نے مجھ ناچیز کے لکھے ہوئے خاکے "صوفی منش اماں" کی تعریف کی۔

آخر میں دعا دیتے ہوئے رخصت چاہوں گی کہ خدا کرے "بیاض" یونہی رنگ و نور کی کرنیں بکھیرتا رہے اور علم وادب کا یہ کارواں رواں دواں رہے۔ آمین

دعاگو

محترم عمران منظور!

السلام علیکم!

اکتوبر کا سرورق جاذبِ نظر تھا۔ کسی مصور کا شاہکار لگتا تھا یقیناً اس کے لیے ہاشم عمران اور حاذق اسد مبارک باد کے مستحق ہیں۔ سیدہ صائمہ کاظمی نے اپنے افسانے "بچپن" میں بچپن کی باتوں و مناظر کی بھرپور منظر کشی کی بلکہ کچھ دیر کے لیے تو ہمیں بھی بچپن میں لے گئیں۔ محمد عارف کی 'یادیں' "آنکھیں بھگونے کے لیے کافی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ زندگی میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو صرف دوسروں کا سوچتے ہیں۔ دوسروں کے لیے قربانیاں دیتے دیتے ایک دن وہ خود قربان ہو جاتے ہیں۔ اور جن کے لیے وہ یہ سب کچھ کرتے ہیں۔ انھیں اس بات کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ کوئی ان کے لیے تکلیفیں اُٹھاتا دنیا سے چلا گیا۔ عارف صاحب نے صحیح کہا کہ دنیا چلچلاؤ کا میلہ ہے اور زندگی قمقموں کی مانند کھسک رہی ہے۔ سلمیٰ اعوان صاحبہ کی اس بات سے اتفاق ہے کہ طارق عزیز کے نام کا میوزیم بننا چاہیے اس لیے کہ ان کی خدمات اتنی ہیں کہ یہ ان کا حق ہے۔ دوسرا ان سے یہ بھی کہیں گے کہ طارق عزیز اور ان کی جنم بھومی کی طرح ہمارے آباؤ

اجداد کا وطن بھی جالندھر ہی تھا۔ جالندھر کو دیکھتے ہوئے جس کیفیت کا اظہار انھوں نے کیا ہے۔ یہ فطری ہے کہ اپنے یا اپنے اجداد کی جنم بھومی دیکھ کر ایسے ہی جذبات و احساسات انگڑائیاں لینے لگتے ہیں۔

سید حامد یزدانی نے ''دیکھنا یہ ہے'' کے عنوان سے خالد احمد کی شاعری پر ایک دلکش اور جذبات سے بھرپور تحریر لکھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خالد احمد نوجوان شعرا کی نہ صرف حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ بلکہ اُن کے لیے ایک تربیت گاہ کا درجہ رکھتے تھے۔ آج بھی اُن کے بنائے کنویں سے نوجوان ادیب و شاعر سیراب ہو رہے ہیں۔ ہم نے تو اپنے بچپن میں محمد سلیم طاہر کو پی ٹی وی سے حالاتِ حاضرہ کے پروگرام کرتے دیکھا کہ ہمارے نزدیک ان کی یہی پہچان تھی۔ شفیق احمد خان نے ''مرصع راز'' کی صورت ان کے اس پہلو سے بھی پردہ اُٹھایا کہ وہ بہت اچھے بھی ہیں۔ ان کے یہ چند اشعار بہت اچھے لگے:

ہوتا جاتا ہے راستہ دھندلا
چلتا رہتا ہے آنکھ پر کوئی
اپنی آنکھوں میں دیکھنے دو مجھے
ایک مدت سے کچھ نہیں دیکھا
بند آنکھوں سے دنیا دیکھی ہے
چشمِ حیرت سے کچھ نہیں دیکھا
تمام شہر مجھے ایک جیسے لگتے ہیں
مری نگاہ میں منظر ٹھہر گیا کوئی
کوئی مکین یقیناً کسی مکان میں ہے
ہوائیں چیختی پھرتی ہیں در نہیں کھلتا

فرحت عباس نے فاطمہ حسن کی شاعری پر ایک جامع تحریر لکھی۔ مضمون کے آخر میں لکھی اُن کی دو نظمیں پسند آئیں۔ یہاں میں تعبیر کے 'بیاض' میں طنز و مزاح کے حوالے سے سیدہ آمنہ ریاض کی لکھی تحریر ''صوفی منش اماں'' کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ کیونکہ اس تحریر کو پڑھتے ہوئے مجھے اپنا گھریلو ملازم 'بوٹا' یاد آ گیا۔ یہ تقریباً 4 سال پہلے کی بات ہے۔ ابوکو رائے ونڈ میں ریلوے کی طرف سے جو کوارٹر ملا تھا۔ اسی وقت یہ ہمارے ہاں آیا۔ کوارٹر کے باہر لگے پودوں کی دیکھ بھال اور گھر کے چھوٹے موٹے کام اس کے ذمے تھے وہ تھا تو ہمارا ملازم مگر گھر کے ایک فرد کی طرح ہو گیا تھا۔ بڑے بھائی کی شادی 7 8 میں ہوئی۔ اس وقت تک ہم بورے والا آ چکے تھے۔ اسے خصوصی طور پر رائے ونڈ سے شادی میں بلا آیا۔ وہ آیا۔ ایک کار کے علاوہ بارات ایک چھوٹی وین میں روانہ ہوئی۔

20,18 سیٹیں تھیں۔ صرف بہت قریبی لوگ ہی جا سکے۔ بوٹا اس بات پر ناراض ہو گیا کہ مجھ ساتھ لے کر کیوں نہیں گئے۔ بڑی مشکل سے امّی نے منایا کہ مجبوری تھی۔ ورنہ تمھیں بھی ساتھ لے جاتے۔ ہوتا ہے ایسا کہ گھریلو ملازم بھی آپ کی زندگیوں کا حصہ بن جاتے ہیں کہ آپ کی اولاد کی طرح ہی آپ سے ناراض بھی ہوتے ہیں۔ غزلوں کے یہ اشعار پسند آئے:

تجھے فرصت نہ ملی تو مجھے رخصت کرنے
ترا لہجہ، ترا چہرہ، ترے رخسار آئے
وہی بھائی، وہی بھاؤ، وہی قدریں خالد
کیا توقع کوئی لے کر سرِ بازار آئے
(خالد احمد)

نہیں کسی کو ضرورت نہیں بتانے کی
اگر ہو شہر میں امن و امان بولتا ہے
کرایہ دار سے پوچھا نہیں ہے میں نے کبھی
جو اس پہ بیت رہی ہے مکان بولتا ہے
(اکرم ناصر)

گنوا دی عمر تب جا کر یہ نکتہ ہاتھ آیا ہے
کہ گاڑی چھوٹ اتنی ہے ذرا تاخیر کرنے سے
جدیدیت کو بھی درکار ہے تڑکا روایت کا
نہ روکو حضرتِ غالب کو ذکرِ میر کرنے سے
(یعقوب پرواز)

میں چاہتا تھا مرا انتظار جاری رہے
سو جان بوجھ کے تاخیر کرنے والا تھا
غزل سے کاٹ دیا ہے وہ شعر بھی میں نے
جو میرے درد کی تشہیر کرنے والا ہے
(وسیم عباس)